بہشت

مصنفہ

بینی پرشاد سنگھ بھٹناگر

قیمت انمول

فہرست مضامین

میری ایک مؤدبانہ درخواست

ہندوستان کی خیرات تو ازل سے ضرب المثل ہے۔ آج بھی ہمارے تاجدار، والیانِ ملک اور مرچنٹ، پرنسیز اور دیگر روسا جہاں لاکھوں کا دان آن کی آن میں دیدیتے ہیں اور دیا کرتے ہیں وہاں چھوٹے لوگ بھی پیسوں اور چھوٹی چیزوں کا دان بھی اپنی بساط بھر ہمیشہ ہی کیا کرتے ہیں۔ اس اپنے یقین پر میں بھی اپنے بزرگوں سے صرف اُن کے تھوڑے سے "وقت" کا دان دست بستہ مانگتا ہوں۔ مجھکو اُمید قوی ہے کہ وہ میری اس درخواست کو قبول کریں گے۔ اور صرف اپنا قیمتی وقت مجھکو دان دیکر اس کتاب کو شروع سے آخر تک بغور و خوض پڑھکر مجھکو اپنے بار احسان سے سرفراز کرینگے۔

بینی پرشاد سنگھ

۲۰۔ اپریل ۱۹۴۵ء

نوٹ:۔ چونکہ اس کتاب کا لکھنا میں نے مارچ ۴۰ء میں ختم کیا تھا۔ اسلئے نفس مضمون کے سلسلہ میں میں نے کہیں کہیں کچھ اُسی وقت کے تاریخی واقعات کی مثالیں دی ہیں۔ مگر جو تاریخی واقعات اب کچھ گھٹ بڑھ گئے ہیں چنانچہ انکو سنہ ۱۹۴۰ء والی فضا کی نظر سے دیکھنے کی تکلیف گوارہ کیجائے۔ کیونکہ وہ سب تمثیلیں ہیں۔ اور زبان کے سقم کو نظر انداز کرکے صرف نفس مضمون پر توجہ کی عنایت سے بھی مشکور کیا جائے۔

دیباچہ

از قلم فیض رقم معلی القاب جناب قاضی نصیر الدین احمد صاحب
ایم۔ اے۔ یوپی۔ آئی۔ ای۔ ایس ریٹائرڈ اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس۔ یوپی

منشی بینی پرشاد سنگھ صاحب آنریری اڈیٹر "کالیستھ ہتکاری" و سابق دار العلوم کی لکھی ہوئی کتاب "بہشت" کے مسودہ کو میں نے بالاستیعاب شروع سے آخر تک پڑھا۔ اگر بہشت یا کسی شئے کی بھی لذت کا لفظوں میں ادا کر دینا ناممکن ہے تو اس کتاب کی جملہ خوبیوں پر مکمل تبصرہ کو قلمبند کرنا بھی مشکل ہے۔ جو کوئی اس کتاب کو پڑھیگا خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا اسکے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ اسکو نئی باتوں کا انکشاف نہ ہو۔ اور اسکو یہ محسوس نہ ہو کہ وہ تاریکی سے روشنی میں آگیا۔ لائق مصنف نے ہر باب میں اور تقریباً ہر صفحہ پر متعدد عالمگیر سچائیوں کے دقیق مسائل کو جو ہر مذہب و ملت کے افراد پر واجب التعمیل ہیں موجودہ زمانہ کے خیالات اور جذبات کے شیشہ میں اُتارا ہے۔ اور سقراطی اصول پر روزمرہ کی زندگی کے تجربوں کی تمثیلات کے ذریعہ اُن کو نہایت ہی سہل الممتنع بنا دیا ہے۔

شخصی خود غرضی کو دنیا کے جملہ آلام و مصائب کی علت ثابت کیا ہے۔ اور اسکی نہایت قابلیت سے تحقیقات کی ہے۔ اسکے دور کرنے اور بچوں کے اخلاق سدھارنے کے حکمی آسان اور عملی طریقے نہایت ہی خوبی سے سمجھائے ہیں

قابل مصنّف نے بتایا ہے کہ بے لوث پریم ہی ایک اکیلی شاہراہ ہے جسکے ذریعہ ہر انسان کی زندگی امن چین، سُکھ اور شانتی کے ساتھ گذر سکتی ہے۔ اور انکا یقین ہے اور اس امر کے صحیح ہونے میں شُبہہ بھی نہیں کہ دنیا کو دُکھ سے نجات اسوقت تک ممکن نہیں جبتک کہ خداوند عالم کی ہستی میں پورا ایمان و یقین نہ ہو۔

لائق مصنّف نے بالشوزم اور کمیونزم وغیرہ کو بجا طور پر ہندوستان کیلئے مہلک اور ناموزوں قرار دیا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات وواقعات پر بھی محققانہ روشنی ڈالی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ لائق و باکمال مصنّف کو نہ صرف اپنے ملک بلکہ دنیا کیلئے سچا درد ہے۔ اور انکے لفظوں سے خلق خدا کیلئے اچھوتا پریم اور بے لوث محبت ٹپکتی ہے۔ مولف نے سچ کہا ہے کہ انھوں نے اپنے دل ہی یعنی اپنے وارداتِ قلب کو دنیا کے روبرو پیش کر دیا ہے۔ اور یہ بھی سچ کہا ہے کہ سونا اور چاندی تو ہاتھ سے دیا جاتا ہے لیکن جو کچھ دل سے دیا جاتا ہے اسکو سونے اور چاندی سے خرید نہیں سکتے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسی مفید اور محبت بھری کتاب جسمیں علم اور طریقۂ عمل دونوں ہی موجود ہوں میری نگاہ سے اُردو زبان میں ابتک نہیں گذری۔ اس کتاب کو انمول کہا جائے تو بالکل مبالغہ نہ ہو گا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب ایسی سلیس اور عام فہم ہندوستانی زبان میں پُر جوش محبت بھرے الفاظ میں لکھی گئی ہے کہ اسکے الفاظ براہ راست دلمیں جاگزیں ہوتے ہیں۔ اور دل پر ایک گہرا اثر کرتے ہیں۔ سچ ہے بابو بنی پرشاد سنگھ صاحب نے اس کتاب کو اردو میں

لکھکر اُردو جاننے والوں پر ایک احسان کیا ہے۔ اس بار احسان سے سبکدوشی کی صرف یہی سبیل ہے کہ اُردو جاننے والے اس کتاب کے بلا پس وپیش خریدکریں، پڑھیں اور اسپر عمل بھی کریں۔ تاکہ موٗلف کی سعی مشکور ہو اور محنت نتیجہ خیز ہو۔

میں اپنے دل سے منشی بینی پرشاد صاحب کو اس تصنیف کی مبارکباد دیتا ہوں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ کتاب کے شایع ہونے کی سبیل جلد پیدا ہوگی۔ اور اُردو دان حضرات ایسی عمدہ کتاب کی قدر کریں گے۔ منشی بینی پرشاد سنگھ صاحب کے اصرار پر میں نے چند سطور لکھدیں۔ ورنہ میں ایسی کتاب کی ریویو کا اہل کہاں۔

بندہ

نصیر الدین احمد ریٹائرڈ اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس

لکھنؤ۔ ۱۰ جون ۱۹۴۰ء

قدرت کا منشا ہے کہ انسان سُکھ میں رہے

بزرگو! نوجوانو!! اور بچو!!!۔

"بہشت" کے نام کا یہ چھوٹا سا پیارا، خوشنما، خوشبودار۔ اور خوشبو پھیلانے والا گلدستہ سچے پریم کے ساتھ آپ کے نذر ہے۔ کیونکہ دنیا میں کوئی ایسا نہیں جو بہشت کا متمنی نہ ہو۔ کوئی تو اپنی زندگی کے بعد بہشت میں جانے کا سامان کرتا ہے۔ کوئی یہ ارمان رکھتا ہے کہ اسکی زندگی ہی چین و اطمینان سے بیتے۔ کہ اس دنیا میں اسکو بہشت جیسا سُکھ ملے۔ اور کسی کی آرزو یہ ہے کہ یہ دنیا اسکے اور دوسروں دونوں ہی کیلئے بہشت بنجائے اور سب ہی امن چین اور سُکھ میں رہیں۔

غرضیکہ اپنے اپنے بہشت کیلئے انسان کیا کیا دان خیرات، زکات اور روپیہ پیسہ جان و مال اور جسم کا تیاگ، پوجا پاٹھ، نماز روزہ، عبادت اور سماجت اور کیا کچھ نہیں کرتا۔ وہ سمجھتا ہے اور مانتا ہے اور یقین بھی کرتا ہے کہ بہشت میں سُکھ ہے چین ہے اور آرام ہے۔ گویا یہ امر مسلّم ہے کہ بہشت کا دوسرا نام ہی آنند، سُکھ اور چین ہے۔ اور جہاں آنند اور چین اور سُکھ ہے وہیں بہشت ہے۔ جہاں آنند کا نام آیا وہاں بہشت کا خیال آتا ہے۔ اور جہاں بہشت کا نام آیا وہاں آنند اور سُکھ کا دھیان آجاتا ہے۔ اب

رہی یہ بات کہ بہشت کہاں ہے؟ زمین کے کسی حصّہ میں ہے یا آسمان پر کہیں ہے یا خلا میں اسکا وجود ہے۔ یعنی بہشت کہیں ہے بھی یا نہیں۔؟ اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں اور نہ ہی کتاب کا اس سے کوئی سروکار ہے۔ کیونکہ میں خود بھی اُن بڑی ہستیوں میں ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا جنھوں نے یہ جان لیا ہے کہ بہشت کا وجود کہیں نہ کہیں پر ضرور ہے۔ البتہ ایک معمولی انسان کی حیثیت سے میں اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ بہشت اچھا ہے اور یہ بھی یقین کرتا ہوں کہ ہر انسان بہشت کا خواہشمند ہے۔ کیونکہ ہمیں یا اُس کیف میں شانتی اور سُکھ کا یقین ہے۔ اسکا وجود چاہے کہیں ہو یا نہ بھی ہو۔ میں تو دنیادار آدمی ہوں اور دنیا والوں سے صرف دنیا ہی کی بات چیت کرنا چاہتا ہوں نہ کہ عقبیٰ کی۔ اور دنیا ہی سے اپنا واسطہ بھی ہے۔ چونکہ دنیا کی بھلائی میں اپنا بھی بھلا ہے اور دنیا کے سُکھ میں اپنا بھی سُکھ ہے۔

ظاہر ہے کہ دنیا میں سب بڑے چھوٹے مرد اور عورت یہانتک کہ چھوٹے سے چھوٹا بچہ بھی جو ابھی پیدا ہوا ہے، بلکہ ہر ایک چرند پرند تک یعنی پوری کی پوری خلقت چاہے وہ زمین پر رہتی ہو یا زمین کے اندر۔ پانی کے اندر یا سمندر کی تہ میں ہو، ہوا میں ہو یا آسمان پر کہیں ہو، غرضیکہ سب کے سب اگر کوئی تمنّا رکھتے ہیں، اگر کوئی آرزو رکھتے ہیں اور اگر وہ کچھ بھی چاہتے ہیں تو وہ سُکھ ہی چاہتے ہیں چاہے وہ کسی طرح پر ہی کیوں نہ ملے۔ اور اُسکے پانے کیلئے کیا کچھ ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ گویا ہر جاندار قدرتی طور پر یہی چاہتا ہے کہ وہ آرام اور چین سے رہے۔ انسانوں میں تو کوئی انسان دولت کے ذریعہ

جسمانی آنند کو حاصل کرتا ہے۔ کوئی علم سے دماغی آنند میں مگن رہتا ہے، اور کوئی روحانی آنند میں مسرور رہتا ہے۔ بہرکیف ہمکو یہ تسلیم ہی کرنا پڑتا ہے کہ ہر جاندار کا یہ قدرتی خاصہ ہے کہ وہ سکھ کا متلاشی ہو اور سکھ کو حاصل کرے۔ مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قدرت نے انسان کو عقل سلیم بھی عطا کی ہے۔ اسلئے اسکا یہ قدرتی فرض ہے کہ وہ یہ بھی سمجھے کہ اس دنیا میں حقیقی آنند یعنی ہمارا دنیوی حقیقی بہشت کیا ہے اور کہاں ہے۔ اور کیسے مل سکتا ہے۔ اور یہی مدعا اس بہشت کے چھوٹے سے گلدستہ کا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی ذی ہوش اور ذی عقل انسان ایسا نہیں ہے جو ایسے بہشت کا متمنی نہ ہو جسمیں اسکی اور دنیا دونوں کی بہشت جیسی زندگی بنے۔

آئیے ہم اور آپ دونوں اس گلدستہ کی دیکھ بھال تو کریں اور دیکھیں تو سہی کہ جو کچھ یہ کہتا ہے کیا چھوٹا منھ اور بڑی بات ہے؟ اگر اسمیں کچھ بھی اصلیت ہے اور کچھ بھی حقیقت ہے اور سچائی ہے تو واقعہ یہ ہے کہ یہ کوڑیوں میں لعل ہے۔

ظاہر ہے کہ ایک گلدستہ سے اپنی میز کی صرف سجاوٹ ہی نہیں ہوتی بلکہ ہماری روح کو آنند بھی ملتا ہے۔ دل و دماغ کو اسکی خوشبو سے تر و تازگی بھی حاصل ہوتی ہے اور ہماری آنکھوں کو بھی تراوٹ ہوتی ہے۔ کیونکہ گلدستہ باغ کے چھوٹے چھوٹے درختوں کے خوشنما اور خوشبودار پھولوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اسیطرح میں یہ بھی گزارش کر دوں کہ نہ تو میں اور نہ میرے خیالات اور تجربات کسی بہت اونچی جگہ سے اترے ہیں اور نہ وہ زمین کی کسی خاص تہ سے نکلے ہیں۔ میں تو عام آدمیوں میں بھی ایک ادنیٰ حیثیت کا آدمی ہوں۔ البتہ میں نے بھی کچھ دنیا ضرور دیکھی بھالی ہے۔ میں نے بھی آپ سب صاحبان کی طرح کچھ سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے بھی آپکی طرح حق کے راستہ پر چلنے والوں

کی رہنمائی سے تھوڑی بہت روشنی پائی ہے۔ اور انھیں بزرگوں کے سدا ہرے بھرے باغ سے جنکو انھوں نے تمام دنیا کے لابھ کے لیے وقت وقت پر لگایا ہے اور بنایا ہے۔ میں نے بھی کچھ خوشنما اور مہکتے پھول چنے ہیں اور انھیں سے اس بہشت کے گلدستہ کو سجایا ہے۔ اور موجودہ زمانہ کے خیالات، جذبات اور ضروریات اور قدرتی اور حکمی تدابیر کے دھاگے سے اسکو باندھا ہے۔ چنانچہ اسکی رنگا رنگی۔ مگر ہم آہنگی، اسکی خوشبو اور اسکا آنند اسکی نزاکت اور اسکے نکتے اور اسکی خوبصورتی اور اسکے لطف اور اسکی جملہ خوبیاں اور باریکیاں اسکے رموز اور اسکے اصول صرف انھیں پھولوں کی نعمت ہے اور انھیں کی برکت اور عظمت ہے۔ اور موجودہ اور آئندہ وقت دونوں کا قدرتی صحیح اور سچا تقاضا ہے۔

سکھ خود ہی حاصل کرنے سے ملتا ہے

میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ زیادہ تر کوئی ایسی بات بھی نہیں ہو سکتی جسکی طرف کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی وقت آپکی توجہ نہ گئی ہو اور پھر جو آپکی آنکھوں کے سامنے ہمیشہ ہی آتی جاتی ہوں۔ اور جنکا تجربہ بچہ جوان اور بوڑھے سب کو کسی نہ کسی شکل میں نہ ہوا ہو۔ مگر یہ بھی ہوا کرتا ہے کہ ہم دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھتے۔ سنتے ہوئے بھی نہیں سنتے۔ وجہ یہ ہے کہ ہمارا پورا دھیان اسطرف نہیں ہوتا۔ اور چونکہ دھیان نہیں ہوتا اسلئے ہم اسپر غور نہیں کرتے اور غور نہ کرنے کی وجہ سے ہم اسکے لطف اور اسکی باریکیوں کو جاننے اور سمجھنے اور انکو برتنے سے محروم رہا کرتے ہیں۔ اسلئے میری غرض اس چھوٹی سی کتاب "بہشت" سے صرف آپکی توجہ چند قدرتی اصولوں

اور قدرتی اور ذہنی ضرورتوں کی طرف دلانے کی ہے نہ کہ کسی بہت بڑی اور اونچی تحقیقات
اور تلقین کی۔ کیونکہ حقیقت میں ہر انسان کا قدرتی اور ازلی رہنما خود اُسکے دلمیں مضمر
ہے۔ میری آرزو صرف یہ ہے کہ ہم اور آپ دونوں ملکر اس گلدستہ کی دیکھ بھال تو
کریں۔ اسکو اپنے دلمیں جگہ تو دیں، اور اُسکو برتیں بھی یعنی اسپر عمل بھی کریں۔ کون کہہ
سکتا ہے کہ کس کو کیا ملے۔ کیونکہ دنیا سب نگاہ ہی کا کھیل ہے۔ سب دھیان یعنی
یکسوئی کا کرشمہ ہے اور تل کے اوٹ پہاڑ ہے۔ اور مجھکو یقین ہے کہ جتنی زیادہ
یکسوئی سے ہم اور آپ اس گلدستہ کو دیکھینگے اور جتنی ہی یکسوئی کے ساتھ ہم اور
آپ اسکے جملہ اصولوں اور باریکیوں پر متواتر غور کریں گے اور جتنے زیادہ ہم گہرے
جائینگے اتنے ہی زیادہ قیمتی اور چمکتے رتن آپ کے اور ہمارے ہاتھ آئیں گے
یہ تو ضروری اور یقینی بات ہے۔

یہ بھی امر مسلمہ ہے کہ باپ کا قرضہ سپوت بیٹے بیشک اُتار دیتے ہیں۔ سر پر بوجھ
رکھا ہو تو اُسکو بھی سہارا دیکر اُتارا جا سکتا ہے، مگر بیمار کو مناسب علاج کرنے
ہی سے شفا ہوا کرتی ہے۔ اور مریض کا مرض دوا کے لفظ کے ورد سے نہیں جا سکتا
بلکہ دوا کے پینے ہی سے جاتا ہے۔ اور بھوک کی تکلیف کبھی بغیر خود ہی کھانا کھائے
نہیں مٹتی۔ باپ اور اُستاد کی آنکھ سے ہمکو کچھ نظر نہیں آ سکتا بلکہ اپنی ہی آنکھ سے نظر آتا
ہے۔ اسطرح دُکھ سے نجات اپنے سوا اور کوئی نہیں دلا سکتا ہے۔ اور سکھ بھی بغیر خود کے
عمل کے کیسے مل سکتا ہے۔ دوسرے یہ بھی امر مسلمہ ہے کہ گلدستہ کی خوشبو جیسے
ایک بوڑھے کو ملتی ہے اور وہ اُس سے لابھ اُٹھاتا ہے ویسے ہی ایک نوجوان کو
اور ٹھیک ویسے ہی ایک بچہ کو ملا کرتی ہے اور وہ اُس سے لابھ اُٹھاتا ہے۔ علاوہ بریں

اسکی خوشبو از خود ہی پھیلا کرتی ہے اور ہمکو ملتی ہے خواہ ہم چاہیں یا نہ چاہیں۔ اسطرح
"امن بہشت" نامی کتاب کا یہ دعویٰ اور اسکی یہ غرض ہے اور اسکا یہی مدعا ہے
کہ وہ بچہ جو کچھ بھی سمجھ بوجھ رکھتا ہے اور وہ اس کتاب کے پڑھ لینے کا بھی اہل ہے
تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ تک اور ایک جوان اور بوڑھا مرد اور عورت سب ہی اس سے
پورے پورے اور یکساں مستفید نہ ہوں، بشرطیکہ وہ خود اس گلدستہ کی ذرا دیکھ بھال
تو کریں، یعنی اس کتاب کو پڑھیں تو سہی۔

انسان جہاں اپنا سکھ چاہتا ہے وہاں وہ دوسروں کے سکھ کا بھی متمنی ہے

میں گزارش کر چکا ہوں اور مجھکو یقین ہے کہ آپ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اپنے
لئے آنند چاہنا ہر جاندار کا قدرتی خاصہ ہے اور دنیا میں کوئی ایسا شخص نہیں ملیگا
جو اپنے لئے اور اُن کیلئے جنکا اُس سے تعلق ہے سکھ نہ چاہتا ہو۔ مگر ساتھ ہی ساتھ
اُسکے دلمیں کبھی نہ کبھی کسی وقت اپنی زندگی میں یہ خواہش نہ ہوئی ہو اور یہ خیال
نہ ہوا ہو کہ دنیا کے اور لوگ بھی سکھ میں ہیں۔ ظاہر ہے کہ جتنے اوتار، پیر اور
پیغمبر دنیا میں آئے اور جو کچھ بھی اور جسوقت بھی اور جس جگہ بھی انھوں نے دنیا
کو تعلیم دی اور جو کچھ بھی انھوں نے کہا یا لکھا وہ سب اسی لئے تھا اور
ہے۔ کہ دنیا میں امن و چین ہو اور دنیا میں بہشت کی سی کیفیت رہے۔
کسی بھی مذہب کے اصولوں کو آپ بغور دیکھیں تو آپ کو کامل یقین ہو جائیگا
کہ ہر ایک محبوب خدا یعنی خدا کے چہیتے نے اسی بات کو چاہا ہے کہ دنیا کو دکھوں سے

نجات ہو اور اسکو سکھ حاصل ہو۔ دنیا کی تمام سوشل، مذہبی اور سیاسی انجمنیں اور کانفرنسیں دنیا کے سکھ آیڈیل ہی اپنے سامنے رکھتی ہیں اور اسی غرض سے کام کرتی ہیں۔ یہانتک کہ کچہریوں اور درباروں کا بھی اصل منشا یہی ہے کہ ہم لوگ سُدھریں اور شانتی کی زندگی بسر کریں جس طرف چاہئے آپ نگاہ دوڑائیں اور جس دل کو چاہے آپ ٹٹولیں اور جس جاندار کے اندرونی آرزو کا آپ احساس کریں آپکو یہی معلوم ہوگا اور صاف صاف نظر آئیگا کہ ہر ایک جو جان رکھتا ہے وہ سکھ ہی چاہتا ہے۔ اور ہر ایک وہ جو جان اور عقل دونوں رکھتا ہے وہ جہاں اپنا سکھ چاہتا ہے وہاں اسکی قدرتی خواہش یہ بھی ہے کہ اور لوگ بھی سکھ سے رہیں۔ کوئی ایسا شخص نہ ملیگا جس نے اگر کسی دوسرے کو کبھی کوئی دکھ پہونچایا ہے خواہ دھوکے میں دیا ہو یا ارادے سے ہی دیا ہو تو وہ اپنے جی میں اسکا تھوڑا بہت بھی افسوس کبھی نہ کبھی اور کسی نہ کسی وقت مرنے کے پہلے یا کم از کم مرتے وقت نہ کرتا ہو۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ اسلئے ہمکو یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انسان جہاں اپنا سکھ چاہتا ہے وہاں دوسرونکے سکھ اور بھلائی کا تھوڑا بہت بھی خیال اپنے دلمیں ضرور ہی رکھتا ہے۔ گویا یہ دونوں باتیں قدرتی ہیں۔ یعنی قدرت کا منشا بھی یہی ہے کہ نہ صرف ہم خود سکھ شانتی میں رہیں بلکہ دنیا کے اور بھی رہنے والوں کے شانتی اور سکھ سے رہنے کے لئے کوشاں ہوں اور اسکو اپنا واجبی فرض بھی سمجھیں۔

مگر انسان سخت دکھ میں ہے

مگر اس قدرتی منشاء کے برعکس ہم دیکھتے کیا ہیں اور پاتے ہم کیا ہیں کہ حیوان

تو چاہے سکھی ہوں اور نہ کبھی شکوہ سے رہتے ہوں مگر انسان تو عام طور پر کسی طرح پر سکھ میں نہیں، کسی کو شانتی نہیں کسی کو اولاد کا دکھ ہے۔ کسی کو اپنے جسم کا کسی کو پیسہ کا کسی کو حکومت کا، اور ہم ہندوستانیوں کو وہ گویا عذاب ہے جس سے مفر ہو۔ قحط آئے دن بنا رہتا ہے کبھی بارش کی زیادتی ہے اور کبھی بارش کی کمی۔ طاعون، ہیضہ، تعصب پھوٹ، فرقہ وارانہ جنگ و جدل اور قسم قسم کی دباؤں اور زلزلوں نے تو ہمارا گھر ہی دیکھ لیا ہے۔ تپ دق اور بیکاری کا وہ عالم ہے کہ ہندوستانی تو جانبر ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ باہر بھی ملک کے ملک آپس میں جنگ کر رہے ہیں ایک ملک دوسرے پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ ایک ملک دوسرے ملک کو ہڑپ کرنے جا رہا ہے۔ کوئی بھی شاید ایسا ملک ہو جہاں آپس میں مار دھاڑ نہ ہو رہی ہو۔ پھر یہ بھی ہم دیکھتے ہیں کہ لاکھوں عزیز جانیں ماری جا رہی ہیں۔ لاکھوں بسنے گھر اجاڑے جا رہے ہیں۔ شہر کے شہر تباہ کئے جا رہے ہیں اور تباہی نہایت زور دلچسپی اور فکر کے ساتھ پھیلائی جا رہی ہے۔ دوسروں کی بربادی کیلئے اربوں روپیہ صرف ہو رہا ہے۔ اور نہ معلوم کتنی نت نئی ایجادیں کی جا رہی ہیں جن کے سننے سے انسانی عقل ہی چکر میں آ جاتی ہے۔ انسان کا خون بہانے کے لئے عجیب سے عجیب اور زیادہ سے زیادہ ہتھیاروں کی تیاری کی دوڑ میں ہر ایک ملک خواہ وہاں جمہوریت ہو یا شاہی خواہ کچھ ہی ہو، سرپٹ جا رہا ہے۔ ہر دیا میں سوشل، پولیٹیکل، مذہبی اور تجارتی لڑائیوں اور فسادوں کا بازار خوب ہی گرم ہے۔ مذہبی اور جسم کے رنگ کے تعصب کی

نہ تو کوئی حد ہے اور نہ حساب اور اُسی مذہب کے نام پر خون کی ندیاں بہائی
جا رہی ہیں جس مذہب کی اصلی غرض دنیا میں شانتی پھیلانے اور دُکھ سے نجات
دلوانے اور سُکھ پہونچانے کی تھی، چار دن کی زندگی میں خاندانی اور اپنے گھر کے
تمام جھگڑے۔ مار پیٹ اور دنگا فساد اور نہ معلوم کیا کیا ہیبت ناک دہولناک
باتیں اور واردات اور دیوانی اور فوجداری مقدمات بس یہی سب چاروں
طرف دیکھنے اور سننے میں آتے ہیں۔ ایک فرقہ یا مذہب کا آدمی دوسرے
فرقہ یا مذہب کے آدمی کو دیکھ ہی نہیں سکتا۔ ایک قوم دوسری قوم کو کھائے
جاتی ہے۔ دنیا کیا ہے صرف لڑائی جھگڑوں اور مصیبتوں اور دنیا بھر کی آفتوں
کا گھر ہے۔ نہ دن چین ہے نہ رات۔ گویا وہ ایک پورے پورے دوزخ کا
منظر ہے۔ اور پھر طرہ یہ کہ یورپ، امریکہ، ایشیا بلکہ تمام دنیا کا دعویٰ یہ ہے
کہ موجودہ تہذیب روشنی کی تہذیب ہے۔ اور موجودہ زمانہ روشنی کا زمانہ
ہے۔ ہوگا! مگر واقعات تو کچھ اور ہی کہہ رہے ہیں۔

ان حالات کی صورت میں میں یقین کرتا ہوں کہ آپ سب لوگوں کے
دل میں اس خیال کا پیدا ہونا ایک ضروری اور قدرتی بات ہے کہ آخر کو
یہ ماجرا کیا ہے۔ اور اسکی کیا وجہ ہے کہ جبکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قدرت کا یہ منشا
ہی نہیں کہ ہم اس قسم کی ایک دوزخی زندگی گزر کریں اور جبکہ انسان کی بھی
یہ خواہش نہیں ہے کہ دنیا نہ صرف اسکے لئے بلکہ ہر انسان کیلئے بہشت بریں ہو
تو پھر کیا وجہ ہے کہ دنیا کی دنیا مصیبتوں، کلفتوں اور پریشانیوں کا گھر بنی ہوئی ہے
ہمکو اور آپکو تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہ دونوں باتیں جو ایکدوسرے کے بالکل متضاد ہیں

یعنی ایک دوسرے کی بالکل ضد ہیں مگر دونوں ہی غلط نہیں ہیں بلکہ دونوں ہی
صحیح ہیں خواہش اور کوشش تو انسان کی یہ ہے کہ دنیا ایک بہشت جیسا
مقام ہو مگر دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ وہ ایک دوزخ سے کم نہیں۔ کیسے تعجب
اور کیسی حیرت کی بات ہے۔ اگر آپ اسباب پر زیادہ غور کریں گے تو
واقعہ ہے کہ آپ کے لبوں پر حیرت اور استعجاب کی مسکراہٹ آئیگی
آپ ہنسیں گے اور آپکو افسوس بھی ہوگا۔ اور پھر آپ کو یہ فکر دامنگیر
ہوگی کہ آخر کو یہ بات کیا ہے اور اسکی حقیقت کیا ہے۔ یقین ہے کہ آپ پھر
یہ بات سوچیں گے کہ آپ خود کی اس دنیا کے ایک باشندہ ہوتے ہوئے
اس بارہ میں کیا اور کہانتک ذمہ داری ہے۔ اور واقعہ ہو کہ جب آپ نے اپنی
ذمہ داری کو محسوس کیا تو یہ خیال بھی پیدا ہوگا کہ اس کیفیت کے تبدیل کرنے
میں آپ کا ذاتی فرض کیا ہے۔ اور پھر یہ سوال آئیگا کہ اس فرض کو آپ کیونکر
اور کس طرح پورا کر سکتے ہیں آیا یہ فرض مشکل ہے یا آسان اور پھر وہ آپ کے
ہاتھ کی بات ہے بھی یا نہیں؟ حالانکہ قدرت تو یہ ہی کہتی ہے کہ دنیا میں کوئی
بھی بڑی سے بڑی ایسی بات نہیں جو انسان نہ کر سکتا ہو۔ صرف شرط یہ ضرور
ہے کہ وہ اسکو کرنا چاہے اور وہ کام قدرت کے منافی نہ ہو۔ اور جب اس کام کو
انسان کرنا چاہتا ہے اور کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے اور کرنا شروع بھی کر دیتا ہے تو
مشکل بالکل ہی آسان ہو جاتی ہے۔ اور میں تو اس نتیجہ پر پہونچا ہوں اور اسی
اُصول پر آتا ہوں کہ مشکل اور آسان دونوں لفظ ہمارے دماغ کی اُپج ہیں
ورنہ حقیقت میں انکا کوئی وجود نہیں، انکی کوئی حقیقت نہیں جس کام کو ہم

نہ کرنا چاہیں وہ مشکل ہے اور جس کام کو کرنا چاہیں وہ آسان ہے۔

بہر کیف چاہے وہ ہمارا فرض مشکل ہو یا آسان ہم آپ دونوں ملکر اوپر کی گتھی کو سلجھانے اور اسکو سمجھنے کی کوشش تو کریں اور دیکھیں تو سہی کہ ہماری خواہشات اور نتیجہ میں کیوں پورب اور پچھم کا فرق ہے خواہش تو یہ کہ دنیا بہشت جیسی رہے اور نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کی موجودہ کیفیت کسی دوزخ سے کم نہیں۔

لازمی ہے کہ اگر ہماری تحقیقات صحیح نکلی اور ہم نے ٹھیک ٹھیک وجہ دریافت کر لی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اسپر فوراً کاربند نہ ہوں اور پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم نہ صرف اپنے ذاتی زندگی کے دوزخ کو بہشت میں تبدیل کر دیں بلکہ اس دنیا کے دوزخ کے منظر اور کیفیت کو بھی بہشت کے منظر اور کیفیت میں بدل نہ دیں۔ اور پھر کیسی خوشی کی بات ہوگی کہ ہمکو گھر بیٹھے ہوئے سب ہی کچھ ملتا ہو۔ اسلئے یہ تھوڑے سے پیسوں کی قیمت کی کتاب آپکی تھوڑی سی توجہ اور تھوڑی سی یکسوئی اور تھوڑے وقت کی نہایت ادب اور بجاجت کے ساتھ درخواست کرتی ہے۔ کیونکہ اسکو کامل یقین ہے کہ اگر آپنے اسکو کچھ بھی بغور دیکھا تو یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ اسکو اپنے پاک دل میں ایک مستقل جگہ نہ دیں۔ اور یہ کتاب آپکو یہ بھی باور کراتی ہے کہ اب اسکو اپنا حقیقی دوست اور اپنا سچا ہمراز ہر وقت اور ہمیشہ پائینگے۔ کیونکہ یہ کتاب اُن بھول اور باطل کے گھنے اور کالے بادلوں کو جو اس دنیا پر اُمڈے ہوئے ہیں پھاڑ دیگی اور حقیقت اور سچائی کا سدا چمکتا آفتاب از خود روشن ہوگا اور نہ صرف اپنی خود کی بلکہ دوسروں کی بھی دنیا بہشت جیسی دنیا بن جائیگی جسکے آثار ہنوز اب بھی ہو چکے ہیں۔ اور ان ہی آثاروں سے

ایک آثار یہ بھی ہے کہ میں اس **بہشت** نامی کتاب کو لکھ رہا ہوں اور پھر مجھکو اسبات کا بھی یقین ہے کہ ہر ہندوستانی کے ہاتھ میں اور اسکے دلمیں اسکو جگہ ملنا لازمی ہے بلکہ قدرت کا منشا یہ بھی یہی ہے۔

علّت اور معلول

دنیا میں کوئی بات کبھی ایسی نہیں ہوتی جسکی کوئی وجہ نہ ہو۔ ہر معلول یعنی کاریہ کیلئے اسکی علّت یعنی کارن ہونا قدرتی ہے۔ موٹی سی بات ہے کہ آم کے پھل کی علت اسکی گٹھلی ہے۔ ہر درخت اور اسکے پھل کی علّت اسکا بیج ہے۔ اگر بیج نہ ہو تو درخت ہی نہ ہوگا۔ پھر بھلا اسکے پھل کیسے مل سکتے ہیں۔ دوسرے یہ بات بھی قدرتی ہے کہ ہر ایک قسم کا بیج زمین ہی میں بویا جاتا ہے۔ زمین ہی اسکی پرورش کرتی ہے۔ زمین ہی سے وہ اُگتا ہے بڑھتا ہے اسمیں پتیاں آتی ہیں وہ بڑا ہوتا ہے۔ پھر پھول آتے ہیں اور پھر پھل آتے ہیں اور پھل کھائے جاتے ہیں۔ اور پھر انھیں پھلوں سے سیکڑوں بیج ہوتے ہیں۔ بعدہٗ یہی بیج انھیں پھلوں اور پھولوں کو پانے کیلئے بوئے جاتے ہیں۔ گویا بیج ایک ہی تھا اسی سے سیکڑوں بیج ہوئے اور ان سیکڑوں بیجوں میں سے ہر ایک ایک بیج سے سیکڑوں بیج پیدا ہونگے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک علّت یعنی کارن کے سیکڑوں و ہزاروں معلول یعنی کاریہ پیدا ہوجاتے ہیں جنکی شکلیں بھی بسا اوقات مختلف ہوتی جاتی ہیں۔ اسلئے اگر انسان یہ چاہے کہ ہزاروں اور سیکڑوں معلول یہ علیحدہ علیحدہ قابو پالے تو ہزاروں برسوں میں بھی یہ ممکن ہی نہیں ہوسکتا۔ البتہ اگر ہم صرف علّت یعنی کارن ہی کو سمجھ لیں

اور اسپر قابو پا جائیں تو یقین ہے کہ ہم اسکے ہزاروں انکشافوں اور ظہوروں کو
اگر وہ چھپے ہیں تو پاسکتے ہیں اور ایک آن میں ہی نیست و نابود کر سکتے ہیں۔ اور
اسی طریقہ پر اگر ہم نے ایک چھوٹے بیج یعنی بنیاد علت یعنی کارن کو سمجھ لیا اور اسکو
اپنا لیا تو اسکے صدہا اور ہزارہا بنیاد ظہور کبھی مختلف شکلوں میں پیدا ہوں گے
یہ بات قدرتی ہے۔ ہمیشہ سے تھی اور اب بھی ہے اور ہمیشہ رہیگی۔ یہ کسی سے بھی
چھپا نہیں ہے کہ ان پھلوں کا میٹھا یا کھٹا ہونا ان بیجوں کی خاصیت پر منحصر ہے۔ زمین تو ہر ایک
قسم کے پھولوں اور پھلوں کے بیجوں کو اپنے پہلو میں جگہ دیتی ہے اور اسکو اُگاتی اور
بڑھاتی ہے۔ اور یہ بھی امر مسلمہ ہے کہ پھول یا پھل بذات خود بیج کے اندر پوشیدہ
رہا کرتے ہیں حالانکہ وہ بیج کو دیکھنے سے دکھائی نہیں دیتے۔ اسلئے پھل اور بیج
میں جو تعلق ہے وہ کارن اور کاریہ کا ہے۔ علت اور معلول کا ہے سبب اور نتیجہ کا
ہے۔ اور یہ تعلق دائمی ہے کبھی ایکدوسرے سے یہ جدا نہیں ہوتے۔ یہ فعل قدرت
ہے۔ قدرت میں یعنی اس دنیا کے جملہ کاموں میں علت اور معلول یعنی کارن اور
کاریہ کا قانون روز روشن کی طرح چمکتا نظر آتا ہے۔ ہر ایک کام اور ہر ایک فعل اسی
قانون قدرت کے تابع ہے۔ قدرت نے کوئی چیز ایسی نہیں بنائی جسکی بنیاد
اٹل اور قدرتی اصولوں پر نہ ہو۔ اصولوں میں نقص یا کمی کہیں نہ ملیگی۔ البتہ یہ ممکن
ہے کہ کہیں کہیں ہماری عقل اُن کے سمجھنے سے قاصر ہو۔ ممکن ہے کہ کوئی اصول
ہماری سمجھ بوجھ کے دائرہ سے باہر بھی ہو۔ قدرت نے دنیا کی بھلائی کیلئے پیغمبروں
اوتاروں اور بڑی بڑی ہستیوں کے ذریعہ اپنے قدرتی پیغام ہمیشہ اور ہر جگہ پر دنیا
کو دیئے ہیں اور یہ پیغام میری ذاتی رائے ناقص میں خلاف عقل یعنی خلاف فلسفہ اور

خلاف قدرت یعنی خلاف سائینس ہو ہی نہیں سکتے۔ اور اگر خدانخواستہ ہمکو وہ خلاف عقل اور خلاف قدرت کہیں معلوم بھی پڑیں تو یقین جاننے کہ وہ ہماری سمجھ بوجھ کا فرق ہے۔ یا بعض لوگوں نے ان پیغمبروں اور اوتاروں سے یا کہ ہم تک تقریر یا تحریر کے ذریعہ پہونچایا ہے تو انھوں نے ممکن ہے کہ اسمیں کچھ اپنی جدت کی ہو۔ بہرکیف قانون قدرت اٹل اصولوں پر اور قدرت پر اور عقل تمیوں پر مبنی ہے۔ اسلئے ہر اصول اور ہر فعل اور ہر بات کی تہ میں علت اور معلول یعنی کارن اور کاریہ کے قانون کا ہونا ضروری ہے۔

دل ہی وہ جگہ ہے جہاں اچھے اور برے خیالات پیدا ہوتے ہیں اور ہم سکھ یا دکھ محسوس کرتے ہیں

جس طرح تمام دنیا میں زمین ایک ہی سی ہے اور ایک ہی شکل کی ہے اور اسمیں اگر جو بویا جائے تو جو نکلتا ہے اور اگر گیہوں بویا جائے تو گیہوں نکلتا ہے۔ لاکھوں قسم کی جڑیاں اور بوٹیاں جو مردوں کو زندہ کرنیوالی ہیں۔ گئی آنکھوں کو روشنی دینے والی ہیں گھاؤں کو بھرنیوالی ہیں۔ اُن سب کا اور ہر قسم کے پودوں اور درختوں کا پیٹ زمین ہی ہے۔ خواہ وہ جڑی بوٹیاں اچھی ہوں یا بُری۔ مفید ہوں یا مضر سب ہی زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ یورپ کے جنگلوں میں ایک ایسا درخت بھی پایا گیا ہے جو ہر جاندار کو خواہ وہ انسان ہو شیر ہو کوئی ہو جو کوئی اسکے نزدیک پہنچ جائے تو اسکو وہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ اسکی ڈالیاں اور شاخیں دفعتاً چاروں طرف سے جھک کر اس جاندار کو ایسا جکڑ لیتی ہیں کہ وہ کسی طرح پر نکل ہی نہیں سکتا۔ جب وہ درخت اس جاندار کا

سب خون چوس لیتا ہے تب پھر اسکی شاخیں اور ڈالیاں اونچی ہو جاتی ہیں۔
غرضکہ کوئی درخت اور پودے کیوں نہ ہوں، خواہ وہ ہمکو زندگی دیتے ہوں یا موت۔ جنکے
پھل میٹھے ہوں یا کھٹے یا کسیلے یا کڑوے سب کے سب زمین ہی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی
طریق کار پر دنیا بھر کے انسانوں کے دل کی بناوٹ بھی ایک ہی طرح کی ہے، اسمیں
کوئی اختلاف نہیں۔ دوسرے یہ بھی تسلیم ہے کہ انسان کے اپنے ہاتھ کی بات ہے کہ اس
اپنی زمین میں وہ چاہے جس قسم کے بھاؤں اور احساسات اور خیالات کے بیج بوئے۔
اسلئے بدون کسی اختلاف کے اور بدون کسی شک شبہ کے یہ بات بھی تسلیم ہے کہ
بھلائی اور برائی، خوشی اور رنج نیکی و بدی جس زمین میں پیدا ہوتے ہیں اور جہاں پر وہ
پرورش پاتے ہیں وہ انسان کا چھوٹا سا دل ہے۔ یہ بات قدرتی ہے۔

جس طرح ہوا ہی بادلوں کو لاتی ہے اور ہوا ہی انکو منتشر کر دیتی ہے اسیطرح
وہ ذریعہ اور وہ جگہ دل ہی ہے جس سے اور جہاں پر انسان چاہے کسی سے محبت
کرے یا نفرت کرے۔ کسی پر ظلم کرے یا اس پر رحم کھائے۔ خواہ وہ خود پاک و صاف
رہے یا گندہ۔ نیک بنے یا برا۔ خواہ اپنے فرائض منصبی کو پریم کے ساتھ ادا کرے
یا اسکو بے دلی اور سستی کے ساتھ کرے خواہ وہ سمجھ بوجھ کے کام کرے یا بے سمجھی اور جہالت
کو اپنا وطیرہ بنائے۔ خواہ وہ جھیل کے پانی کی طرح ساکت رہے اور شانتی و اطمینان
کے ساتھ زندگی بسر کرے یا بہتے ہوئے دریا کی طرح یا بگولے میں تنکے کی طرح بیقرار و منتشر
دکھ میں رہے یا دکھ سے نجات پائے۔ اسلئے ہم یقینی طور پر اس نتیجہ پر آتے ہیں کہ گویا
ایک معنی میں انسان کا دل ہی گویا علت یعنی کارن ہے۔ اور خوشی و رنج، مفلسی اور امیری
آرام اور تکلیف وغیرہ یہ سب معلول یعنی کاریہ ہیں۔ کیونکہ خوشی اور رنج دونوں ہی بے ثبات

ہیں اور ابھی نہیں۔ ابھی ہمارے پاس تار آیا کہ تمہارا مکان جلکر خاک سیاہ ہو گیا اور ہم بیاکل ہو گئے۔ روئے
اور چلائے بھی۔ مگر بعد میں یہ معلوم ہوا کہ یہ تار کسی اور کا تھا ہمارے نام کا تھا اور تار والا اُسے ہم سے بھی
گیا۔ ہم خوش ہو گئے اور ہنسے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ظاہر ہے کہ خوشی و رنج آرام و تکلیف ماننے یا نہ ماننے کی
باتیں ہیں۔ بہت لوگ ایسے ثابت قدم اور مستقل مزاج ہوتے ہیں کہ وہ خوشی و رنج دونوں ہی کا کوئی اثر نہیں لیتے جیسے
پہاڑ چوہے کے بوجھ کا کوئی اثر نہیں لیتا۔ اور بہت سے ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو
ذرا سی خوشی میں تو اچھل پڑتے ہیں اور تھوڑی سی تکلیف یا مصیبت میں گھر کو سر پہ
اٹھا لیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ خوشی اور رنج وجود نہیں رکھتے یعنی معلول ہیں۔
اور علت اصل میں ہمارا دل ہے جیسا چاہے وہ خیال کرے۔ اسکے علاوہ ہم ایک اور
دوسرے نتیجہ پر بھی آتے ہیں کہ قدرت نے ہمکو مکمل آزادی بھی بخشی ہے کہ اس اپنی زمین
میں یعنی اپنے دل میں ہم جو چاہیں بوئیں اور ہم جو بوئینگے وہی پیدا ہوگا۔ یعنی جیسے ہمارے
خیالات اور جذبات ہونگے اور رہیں گے ویسے ہی ہمارے افعال بھی ہوں گے۔
اور بعض اپنے افعال کے مطابق ہم ہی کو انکے پھل کھانے کو ملیں گے یعنی انہیں
کے مطابق ہمکو سزا یا جزا دکھ یا سکھ ملیگا۔ گویا مکمل آزادی بھی ہر انسان اور
ہر ملک اور ہر قوم کا قدرتی حق ہے یہی حکم قدرت ہے۔
غرضیکہ ہر قسم کی خوشی اور ہر قسم کے رنج و نیز راحت اور تکلیف کے سبب کا
قیام اصل میں ہمارے دل کے اندر ہے نہ کہ ہمارے باہری ظاہر فعلوں میں۔
جسطرح ہر ایک پودے اور درخت کی جڑیں زمین ہی میں رہتی ہیں اور زمین ہی
انکی پرورش کرتی ہے اسیطرح ہماری زندگی کے جملہ خیالات اور افعال کی جڑ ہمارے
دل میں ہے وہیں وہ جڑیں پھوٹتی ہیں وہیں پر پرورش پاتی ہیں اور ایک درخت

پہنچاتی ہیں اور وہیں سے وہ درخت بڑھتا ہے اور اسمیں پھول و پھل آتے ہیں۔ اور پھر چاہے اسکے پھل میٹھے ہوں یا کڑوے، کیونکہ پھلوں کا اچھا یا خراب ہونا اس بیج کے اچھے یا برے ہونے پر منحصر ہے جو ہم نے اپنے دل میں بویا تھا۔ بونے کے بعد ہم اپنی دماغی طاقتوں سے اسکو سینچتے ہیں اور اسکی پرورش کرتے ہیں اور پھر اسکے پھلوں کو ہم ہی کھاتے ہیں اور اسکا کھانے والا اصل میں کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

جس طرح پرند ایک مادہ پرند انڈے دیتی ہے۔ اور جب انڈے کو لاتے ہیں تو انکو مادہ اور نر دونوں ہی سیتے ہیں۔ اور جب انڈوں سے بچے نکل آتے ہیں تو ان بچوں کا کھلانا پلانا اور پرورش کرنا نر اور مادہ دونوں ہی کے ذمہ ہوتا ہے اسیطرح کسی چیز کے دیکھنے، یا سننے یا اسکے احساس کرنے یا سونگھنے یا ذائقہ لینے، چھونے اور پکڑنے یا کسی چیز پر غور کرنے پر پہلے ہمارے دل میں بھاؤ یعنی جذبات پیدا ہوتے ہیں خواہ وہ جذبات اچھے ہوں یا برے اور پھر ان بھاؤں کو ہمارا چیت یعنی ہمارا خیال اور ہماری بدھی یعنی ہماری عقل دونوں ملکر پختہ کرتے ہیں یعنی اپنا فیصلہ دیتے ہیں۔ اور اسکے بعد ہم عمل کرتے ہیں اور پھر جسکی ذمہ داری ہمارے ہی اوپر ہوتی ہے۔

اب ایک دقیق سوال اس جگہ پر پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دل بذات خود تو ایک عضو ہے جسکو ہم نے زمین سے تشبیہ دی تھی۔ پھر اس سے کام لینے والا کون ہے۔ اور جس کام لینے والے کو ہم عام طور پر "ہم" کہتے ہیں یعنی اصل میں "ہم" کیا ہیں؟ آنکھ، ناک، کان، زبان، پاؤں اور دل وغیرہ سب کے سب حقیقت میں عضو ہیں۔ ٹھیک جیسے ہمارے پران

یعنی ہماری جان بھی گیان سے خالی ہے اور کسی دوسرے کی محتاج ہے۔ یہ سب از خود حرکت نہیں کر سکتے۔ اور نہ انمیں گیان یا قوت تمیز ہی ہے بلکہ یہ گیان سے خالی یعنی جڑ ہیں۔ پھر وہ کونسی طاقت ہے جو ان سب سے کام لیتی ہے اور خوشی اور رنج اور آرام اور تکلیف کو محسوس کرتی ہے؟ ذرا بھی غور کیا جائے تو معلوم ہوگا اور جسکو ایک بچہ بھی محسوس کر سکتا ہے کہ انسان کے اندر ایک قوت ایسی ضرور ہے جو یہ بتلاتی ہے اور دیکھتی ہے کہ ہم اسوقت کیا خیال کر رہے ہیں۔ اور جو قوت بلا آنکھوں کے دیکھ سکتی ہے، بلا کانوں کے سُن سکتی ہے۔ اور بدن بیرون کے اندر بیٹھے ہوئے دور دراز کی سیر کر سکتی ہے اور یہ وہ طاقت ہے جو ہماری بدھی، من اور جملہ اندریوں یعنی حواس خمسہ اور پرانوں سے کام لیتی ہے یعنی انھیں ہتھیاروں کے ذریعہ خود کام کرتی ہے۔ بہرکیف وہ ہی یہ طاقت ہے جو ہر خوشی اور غم اور ہر بھلائی اور بُرائی کو محسوس کرتی ہے۔ ہمارا سب کا تجربہ ہے کہ یہ طاقت اسی رنگ میں رنگ جاتی ہے جس رنگ کے خیالات کو وہ اپنے پاس آنے دیتی ہے۔ ٹھیک جیسے شیشہ کے گلاس میں اگر سُرخ پھول رکھدیئے جائیں تو شیشہ باہر سے سُرخ معلوم پڑیگا۔ اگر اسمیں زرد رکھ دیئے جائیں تو شیشہ زرد نظر آئیگا۔ اور اگر سفید اور کالے رکھدیئے جائیں تو وہ شیشہ سفید یا کالا نظر آئیگا۔ چنانچہ یہ طاقت جو ہمارے اندر ہے وہ نہ دیکھی جا سکتی ہے اور نہ سُنی جا سکتی ہے۔ بلکہ جو خود ہمارے ہر ایک خیال کو دیکھتی ہے کہ اسوقت ہمارا خیال کہاں جا رہا ہے۔ خیال میں محبت ہے یا نفرت، غصہ ہے یا شانتی اور اس قوت کا نام روح یعنی آتما ہے۔ یعنی دراصل محرک روح ہے اور جس جگہ

وہ حرکت کرتی ہے وہ ہمارا دل ہے۔ یعنی روح کی حرکت کا نام دل ہے۔
میرے خیال میں کسی سمجھدار بچّے تک کو اس بات کے سمجھنے میں دقت نہ ہوگی میں تو
یہ چاہتا ہوں کہ ہر ایک بچّے تک اپنی چھوٹی سی عمر سے اپنے خیالات کی طرف نگاہ
رکھنے اور اُنکی دیکھ بھال کرنے کی عادت ڈالے اور سمجھے کہ ہر خیال کے محرک،
اور مالک ہم خود ہیں اور جہاں پر یہ جذبات پیدا ہوتے ہیں وہ جگہ ہمارا دل ہے۔
چنانچہ میں یہ گزارش کرونگا کہ جبکہ ہماری بھلائی اور بُرائی کا مسکن اور اس کا
منبع دل ہی ہے تو دنیا کے بیوپار میں اور دنیا کے جھگڑوں کے بارے میں
اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ ہماری دنیوی بہشت اور دنیوی دوزخ کا مسکن ہمارا
دل ہی ہے اور اُس دل میں رہنے والی اور اُسکو برتنے والی جو قوت ہے وہ
ہماری روح ہے۔ اور وہ شئے روح ہی ہے جسکو "ہم" کے نام سے کہا جاتا
ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ہم سب کو ان دونوں اُمور سے کلّی اتفاق ہوگا۔
دوسرے ہم نے یہ سمجھ لیا اور دیکھ لیا کہ دل ہمارا ہی ہے اور ہم ہی اسکے
مالک یا راجہ ہیں تو پھر یہ ہمارے بس کی بات ہونا چاہیئے کہ ہم اپنے دل کو
خوش یا سُکھی رکھیں۔ اور ہم ان ذریعوں اور اُن طریقوں سے بھی متلاشی ہوں
جن سے ہمکو خود سُکھ حاصل ہو۔ اور نہ صرف اپنے ہی لیئے بلکہ دوسروں کے
لیئے بھی اس دنیا کو بہشت بنا سکیں۔ بہ الفاظ دیگر ہماری یہ جستجو ہونا ہمارے انسان
ہونے اور عقل دیئے جانے کا تقاضا ہے۔ اور ہمارا فرض بھی ہے کہ ہم اس
امر کی صحیح تحقیقات بھی کریں کہ ہماری خود کی زندگی خوشی شانتی اور چین کے
ساتھ کیونکر اور کس طرح بیت سکتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کی

اور تمام دنیا کے رہنے والوں کی زندگی بھی ایسی ساکت اور شانت اور خوش کسطرح پر ہو سکتی ہے۔ جو مدعا اس بہشت نامی کتاب کا ہے۔

اگر ناظرین خاطر نہ ہوں تو میں یہ بھی اپنا ذاتی خیال عرض کر دوں کہ میری ناچیز رائے اور تجربہ میں جسوقت ہمارا دل اور ہمارے خیالات پارہ کی طرح بیقرار ہیں اور پریشان اور متفکر ہیں اور ایک منٹ کو بھی کسی جگہ پر قائم نہیں ہو سکتے ہیں اور ہم رنجیدہ اور مغموم ہیں اور ہمارے خیالات گندے ہیں تو سمجھنا چاہئیے کہ اسوقت گویا ہم دوزخ میں ہیں اور اگر ہمارا دل اور ہمارے خیالات ساکت شانت اور خوش ہیں اور ہم دوسروں کا بھلا سوچ رہے ہیں اور دنیا کی بھلائی میں مشغول ہیں اور ہمارے خیالات پاک اور ستھرے ہیں تو ہم اسوقت بہشت میں ہیں۔ بالفاظ دیگر اپنا دوزخ اور اپنا بہشت ہر وقت اپنے ساتھ ہے۔ اور یہ اپنے ہی ہاتھ کی بات ہے کہ چاہے ہم دوزخ میں رہیں اور چاہے بہشت میں۔ جب کبھی آپ پریشان ہوں اور بے چین ہوں تو آپ اپنے دل کو ساکت شانت اور خوش رہنے کیلئے کہیں اور اصرار کریں اور چاہے صرف ان ہی الفاظ کو دل ہی دل میں کئی بار دوہرائیں تو آپ دیکھیں گے کہ کیا نمایاں تبدیلی آپکے خیالات میں فوراً ہو جاتی ہے۔ نہ صرف آپکی پریشانی اور الجھن کافور ہو جاتی ہے بلکہ آپ کے دل میں ایک اطمینان پیدا ہو جاتا ہے۔ اور آپکو ایک خوشی محسوس ہوتی ہے۔ اور آپکے چہرے اور لبوں پر اس خوشی کا اظہار از خود ہو جاتا ہے۔

یہانتک ہم نے اور آپنے کچھ اصولی اور قدرتی باتیں خوب سمجھ لیں اور پالیں، اور واقعہ ہے کہ دنیا میں ہم کبھی کسی کام میں کامیاب نہیں ہو سکتے

جب تک کہ ہم اس کام کے متعلقہ اصولوں کو اچھی طرح سمجھ نہ لیں اور جان نہ لیں اور
انکو صرف سمجھ ہی نہ لیں بلکہ اُن پر چلیں اور اپنے خیالات میں گفتگو میں اور اپنے افعال
میں ہر وقت انہی اصولوں پر اپنی نظر رکھیں کیونکہ بے اصولی زندگی اور بے اصول
کے کام دونوں ہی ایسے ہوتے ہیں جیسے ایک تنکا جو دریا میں بہتا چلا جا رہا ہے۔ وہ
غریب یہ جان نہیں جانتا کہ اسکو کدھر اور کہاں جانا ہے۔ اسکا بہنا تو دریا کی
موج پر منحصر ہے۔ جہاں چاہیں لہریں اسکو بہا لیجائیں۔ اور جہاں چاہیں اسکو پھینک دیں۔
چنانچہ ہم نے اور آپ نے بھی کچھ اصولی باتیں خوب ہی سمجھ بوجھ کے طے کر لی
ہیں تاکہ ہم بھی اپنے راستہ سے اور اپنے آئیڈیل سے کبھی نہ بہکیں جس طرح کہ
ایک مکان کے ہر کمرہ میں دالان میں اوپر نیچے اور صحن میں باہر بھیتر روشنی رکھی
جاتی ہے تاکہ راستہ میں چلنے پھرنے میں ہم ٹھوکر کھا کر گر نہ پڑیں اور چوٹ کھائیں
اور اپنی جان سے بھی جائیں اسیطرح یہ اصول بھی وہ شئے ہیں جو ہمکو اپنی زندگی
کے سفر میں مشعل کا کام دیتے ہیں۔ اور دنیا کو اکثر راہ دکھانے والوں نے
اسی وجہ سے تاریک بھی بتلایا ہے۔ اسلئے انکا بھی یہی کہنا ہے کہ اگر ہم اصولوں
کی روشنی کے سہارے ہمیشہ چلیں گے تو ہم بلا کسی خوف و خطر کے اور بلا کسی
روک ٹوک کے اپنے راستہ پر سیدھے چلے جائینگے اور منزل مقصود پر پہنچیں گے۔
اسلئے قبل اسکے کہ ہم اپنے تحقیقاتی سفر میں اور آگے بڑھیں اور اپنے مطلب
پر آئیں یہ ضروری ہے کہ جن خاص اصولوں کو ہم نے طے پا لیا ہے انکو ہم دوہرائیں
تاکہ ہم کبھی اپنے راستہ سے ذرا بھی نہ ہٹیں کسی بات کا دوہرانا بذات خود ایک
بہت ہی بڑا بلکہ سب سے بڑا اصول ہے۔ بار بار دوہرانے کو جب یعنی ورد کہتے ہیں

اور جو بات سمجھ بوجھکر بار بار دوہرائی جاتی ہے تو وہ یاد ہو جاتی ہے اور حفظ ہو جاتی
ہے اور جب وہ خوب حفظ ہو جاتی ہے تو پھر وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہر وقت
رہا کرتی ہے۔ اور ہم اسپر دھیان بھی کیا کرتے ہیں۔ اسپر غور و خوض بھی کرتے ہیں اور
جس اصول یا بات یا چیز پر ہم دھیان لگایا کرتے ہیں تو وہ ہمکو ملجاتی ہے یعنی
یہ کہ ہم اور وہ دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں آپس سے وصل
ہو جاتا ہے۔ دونوں ہی طالب اور مطلوب میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ اسی کا جامہ
پہن لیتے ہیں اسی کا ہم کو سرور ہو جاتا ہے۔ پھر وہ بات ہماری ہمراز ہو جاتی ہے۔
اور ہم اسکے ہمراز ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ہم بھی ویسے ہی اور اسی کی طرح ہو جاتے ہیں
جیسے کہ لوہے کا گولا اگر آگ میں دیر تک رکھا جائے تو وہ دکھائی ہی نہیں دیتا۔
کہ وہ کہاں پر ہے اور آگ ہی کے رنگ کا ہو جاتا ہے۔ پھر اسکے خواص بھی آگ کی طرح
جلانے والے ہو جاتے ہیں۔ میں آپکو یقین دلاتا ہوں اور میرا ذاتی تجربہ بھی ہے
کہ آپ جس کتاب کو بھی سمجھ بوجھکر دھیان سے پڑھیں گے اور پھر جتنی مرتبہ
آپ اسکو سمجھ بوجھکر دوہرائینگے اتنی ہی بار آپکو نئے نئے راز کا انکشاف
ہوگا۔ اسی اصول کے مطابق میں نے بھی کہیں کہیں کچھ باتوں کو اس کتاب میں
دوہرایا ہے تو اسکی غرض صرف یہی ہے کہ وہ بات اور وہ اصول ہمارے دلوں پہ
نقش ہو جائیں اور ہمارے دلوں پر جم جائیں۔ چنانچہ یہ گزارش ہے کہ ہم نے
ابتک جو اصول طے پائے ہیں انمیں سے ذیل کے اصول زیادہ اہم اور قابل یاد
رکھنے کے ہیں (۱) قدرت کا منشا یہی ہے کہ اسکی خلقت شگفتہ میں رہے (۲)
قدرت نے انسان کو فعل کی آزادی بخشی ہے اور ہر فعل کا ذمہ دار انسان خود ہے

(۳) ہر قسم کی خوشی اور رنج کی علت یعنی کارن کا قیام انسان کے دل میں ہے نہ کہ اسکے ظاہر افعلوں میں (۴) خوشی اور رنج، آرام اور تکلیف معلول یعنی کاریہ ہیں انکا کوئی وجود نہیں، کبھی ہیں اور کبھی نہیں۔ اور معلول یعنی کاریہ کی شکلیں بھی سیکڑوں ہو جاتی ہیں جو ایک دوسرے سے دیکھنے میں بھی اکثر مختلف ہوتی ہیں مگر دراصل انکی علت یعنی کارن ایک ہی ہوتا ہے۔ پھر جسکو سمجھ لینے سے اور جسپر قابو پا لینے سے ہم اسکے جملہ کاریوں یعنی معلول پر قادر ہو سکتے ہیں (۵) وہ قوت تمیز جو دل کو متحرک کرتی ہے، وہ ہماری روح یعنی آتما ہے۔ اور اپنی روح سے اشارہ اور مطلب "ہم" کا ہے۔ اور دل کے مالک ہوتے ہوئے ہمارا اور ہر انسان اور ہر لڑکے تک کا بھی انسانی فرض ہے کہ ہم اپنی نگاہ اپنے دل اور اسکے جذبات اور خیالات پر رکھیں اور اسپر ہمیشہ اور ہر وقت قادر رہیں۔

نیکی جب ہی داخل ہو سکتی ہے جب بُرائی نکال دی جائے

چنانچہ ان اصولوں پر نگاہ رکھتے ہوئے اب ہم اپنے مدعا کی تحقیقات شروع کرتے ہیں کہ وہ ذرایع اور وہ طرائق کیا ہیں جن کے اختیار کرنے سے ہم نہ صرف اپنی ہی زندگی کو بلکہ دوسروں کی اور تمام دنیا والوں کی زندگی کو بھی خوش و خرم بہشت جیسی بنا سکتے ہیں۔ مگر یہ قدرتی اصول ہے کہ ہم نیک جب ہی ہو سکتے ہیں جبکہ ہم برائی کو چھوڑ دیں۔ اور برائی ہم تب ہی چھوڑ سکتے ہیں جبکہ ہم برائی اور اسکے نقصانات و تکلیفات کو جان لیں۔ اسلئے یہ نہایت ضروری اور اصولی بات ہے کہ ہم ان خرابیوں کو بخوبی سمجھ لیں کہ وہ کون کون سی خرابیاں ہیں اور انکے وجوہ کیا ہیں جن کے سبب سے ہمارے

دل و دماغ پریشان بیقرار اور دکھی رہتے ہیں۔ ہماری زندگی ہی تلخ ہو جاتی ہے۔
اور ایک بوجھ معلوم ہوتی ہے۔ اور جسکی وجہ سے پھر دنیا بھر کے رنج و الم اور
فساد اور لڑائی جھگڑے برپا ہو جاتے ہیں اور ہمکو کہنا پڑتا ہے کہ دنیا ایک دوزخ
ہے۔ موٹی سی بات ہے کہ جو کوئی کاشتکار اپنے کھیت کو بونے جاتا ہے اور
جو مالی کسی کیاری میں پودے لگانے کا ارادہ کرتا ہے تو دونوں کے دونوں اپنے
کھیت اور کیاریوں سے کنکر پتھر اور جنگلی گھاس کو اکھاڑ پھینکتے ہیں۔ اور زمین
کو صاف و ہموار کر لیتے ہیں تب اسمیں بیج بوتے ہیں ورنہ جو بویا جاتا ہے بیکار جاتا ہے۔
واقعہ ہے کہ جس گلاس میں پانی بھرا ہوا ہو اگر ہم اسمیں دودھ پینا چاہتے
ہیں تو یہ واجبی اور اصولی بات ہے کہ ہم پہلے اُس گلاس کو پانی سے خالی کر لیں
ورنہ اگر اسمیں دودھ ڈالیں گے تو دودھ باہر گر جائیگا۔ اور دودھ بھی خراب جائیگا۔
بلکہ سب لوگ اور بچے تک ہماری اس کوشش پر ہنسیں گے اور ہمکو شرمندہ ہونا پڑیگا۔
اسی طریق پر جبتک ہم اُن برائیوں اور خرابیوں کو اچھی طرح جان نہ لیں گے اور انکے
وجوہ کو اچھی طرح سمجھ نہ لیں گے اور انکے عظیم نقصانات اور انکی تلخی کو اچھی طرح محسوس
نہ کر لیں گے جنکی وجہ سے ہماری زندگی عذاب جان ہو رہی ہے اور دوزخ بنی
ہوئی ہے ہم انکو اپنے دلوں سے نکال دینے کی پوری کوشش بھی نہ کرینگے۔ اور جبتک
ہم اپنے دلوں کو ان برائیوں سے صاف نہ کر لیں گے ہم انمیں اچھائی کے بیج بھی نہیں
بو سکتے۔ اور اگر بونے کی کوشش بھی کریں گے تو وہ کوشش بے سود و بیکار ہوگی
اور یہ بھی ہمارے دن و رات کا تجربہ ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ والدین اعلیٰ
سے اعلیٰ مدرس اور بڑے بڑے رہنما ہمکو و نیز بچوں کو راہ راست پر لانے میں

اسوجہ سے اکثر قاصر رہتے ہیں کہ وہ پانی بھرے گلاس میں دودھ بھر دینے کی
کوشش کرتے ہیں ۔

شخصی خود غرضی ہی دنیا کی تمام تکلیفوں کی جڑ ہے

ہمارا یہ یقین ہے کہ خدا ایک ہے یعنی اسکی ذات واحد ہے چاہے اسکے
اوصاف ان گنتی ہوں ۔ سورج بھی ایک ہی ہے ۔ زمین بھی ایک ہی ہے ۔ چاند بھی ایک
ہی ہے چاہے اُن سبکے کام بہت سے ہوں ۔ سب انسان بھی ایک سے ہیں
چاہے اُنکی شکلیں اُنکے اوصاف کے مطابق الگ الگ کتنے ہی کیوں نہ ہوں
علاوہ بریں ہم یہ بھی طے پا چکے ہیں کہ علت ایک ہی ہوتی ہے مگر اُسکے معلول و ڈھنگی
شکلیں ہزارہا جدا جدا ہو جاتی ہیں ۔ خدا علت یعنی کارن ہے ۔ اور دنیا کاریہ
یعنی معلول ہے ۔ اور نہ معلوم کتنی دنیا ہیں ۔ کہتے بھی ہیں کہ ایک خدا کو جان لو،
دنیا کو جان جاؤ گے ۔ انھیں باتوں کو قدم بہ قدم ایک ایسی اچھائی کا ہونا جسمیں
قریب قریب سب ہی اچھائیاں آجائیں اور ایک ایسی برائی کا ہونا جسمیں قریب
قریب کل برائیاں آجائیں بلکہ جو سب برائیوں کی علت یعنی کارن ہو سمجھ میں
آتا ہے ۔ بلکہ یہ ہونا لازمی اور قدرتی ہے ۔ گویا اب یہ ضروری ہوا کہ
پہلے ہم یہ دریافت کریں اور جانیں کہ وہ ایک برائی کون سی ہے جو سب
برائیوں کی علت ہے یعنی سب برائیوں کی پیدا کرنیوالی ہے ۔ اور اگر ہمکو جملہ
برائیوں کی علت یعنی کارن معلوم ہوگیا اور اسپر ہم نے قابو پالیا یعنی اُس کلی ہی کو
ہم نے دل سے نکالدیا تو گویا ہمکو جملہ برائیوں سے نجات ملی ۔ ہماری مشکل کیسی

آسانی سے حل ہو گئی اور ہم کیسے سیتے چھوٹ گئے اور دنیا کا بھی عذاب ہٹا - اور اسی طرح اگر ایک وہ اچھائی معلوم ہو گئی جو سب اچھائیوں کی ماں یعنی کارن ہو تو اگر ہم نے اُس اکیلی اچھائی کو ہی گرفت کر لیا اور اپنا لیا تو گویا ہم نے سب ہی اچھائیوں کو پا لیا اور ہماری دنیا دونوں کی زندگی بہشت جیسی زندگی بنی اور پھر کیسی سہولت ہو اور آسانی سے بنی - واقعہ یہ ہے کہ تنکے کی اوٹ پہاڑ ہے - صرف ذرا سمجھ بوجھ کر قدم رکھنے کی ضرورت ہے ۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ دنیا کے تمام جھگڑوں، فسادوں، مصیبتوں اور بُرائیوں کلفتوں اور دُکھوں کی جو جو بھی صورتیں ممکن ہو سکتی ہیں خواہ وہ جنگ کی شکل میں ہوں یا سول یا ملکی یا مذہبی لڑائیاں ہوں خواہ وہ فرقہ وارانہ تعصب کی صورت میں ہوں یا گھر کے آپس کے جھگڑے اور بدگمانیاں ہوں، دیوانی اور فوجداری مقدمے ہوں، تجارتی اور مالی رقابت ہو، نفرت ہو، روباہ بازی ہو، بدنفسی ہو بدکلامی ہو، بداطواری ہو، لالچ ہو، جھوٹ ہو، غرور ہو، بے ایمانی ہو، بددیانتی ہو، حق تلفی ہو، فریب ہو، کپٹ ہو، چھل ہو، بناوٹ ہو، ظاہرداری ہو، اندر کچھ ہو اور باہر کچھ ہو، دورنگی ہو، تنگدلی ہو، تنگ چشمی ہو، نمائش ہو، خودبینی ہو، اور خودنمائی ہو، خودپسندی، بغض ہو حسد ہو، بدلہ ہو، بے انصافی ہو، بے رحمی ہو، سنگدلی ہو، لوٹ ہو، دغا ہو، مکر ہو، غصہ ہو، خوف ہو، انانیت ہو، ملک یا دین فروشی ہو، جو کوئی بھی بُرائی ہو اگر ان سب کی وجہ اور سبب پر آپ غور کریں گے اور گہرے جائینگے تو آپکو صاف نظر آئیگا کہ ان سب کی جڑ ایک ہی ہے ۔ انکا سبب ایک ہی ہے اور انکی علّت یعنی کارن ایک ہی ہے - اور وہ ہماری

ذاتی خود غرضی یعنی اپنی خود کی خود غرضی ہے۔ گویا ذاتی خود غرضی ہی دنیا کے تمام عذابوں اور تکلیفوں اور بُرائیوں اور بدبختیوں کی جڑ ہے۔

اب آئیے ہم اور آپ دونوں ملکر دیکھیں اور فیصلہ کریں کہ یہ میرا دعویٰ کہاں تک صحیح ہے۔ اور واقعہ ہے کہ اگر یہ میرا دعویٰ صحیح نکلا تو کتنی بڑی اور اہم بات ہمکو ملجاتی ہے کہ صرف اپنے ہی عیب کو دور کر دینے سے یعنی اپنی ذاتی ایک ہی بُرائی یعنی خود غرضی کو اپنے دل سے نکال دینے سے ہم نہ صرف اپنی ہی ذاتی زندگی کو ہی بلکہ اپنے ملک اور دنیا کی زندگی کو بھی جملہ برائیوں سے پاک کر دیتے ہیں اور پھر ہماری خود کی زندگی اور ہماری کل دنیا ہمارے لئے اور سب کیلئے دوزخ نہیں رہتی۔

ہمارے خیال میں کوئی بھی انسان بوڑھا جوان یا بچہ ایسا نہ ملیگا جو اپنی ایک بُرائی کو سمجھنے اور نکال پھینکنے کیلئے اپنے سب کچھ کا ایثار نہ کر دے اور اسے اپنے دل سے عمل کرنے کیلئے بیقرار نہ ہو جائے جبکہ وہ دیکھتا ہے سمجھتا ہے اور اسکو یقین بھی ہو گیا ہے کہ اپنی ذاتی خود غرضی کو اپنے دل سے بس نکال دینے سے نہ صرف اسکی زندگی بلکہ تمام دنیا والوں کی زندگی بہشتی زندگی بنتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم اور دنیا دونوں ہی دوزخ سے نکلکر بہشت میں جاتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر سوئے تھے دوزخ میں اور جاگے بہشت میں۔ اور یہی مدعا اس چھوٹی سی کتاب کا ہے۔

خود غرضی کیا ہے اور کہاں ہے۔ اور وہ حقیقت میں وہ الگ بات ہے

بیقرار تو ہم ضرور ہو گئے۔ اور تہیہ اور پکا ارادہ بھی ہم نے کر لیا کہ ہم خود غرضی کو

اپنے دل سے نکالکر ہی اب دم لینگے۔ مگر ہم دیکھیں تو سہی کہ خودغرضی ہے کیا بلا اسکی شکل کیسی ہے۔ کہاں اسکا قیام ہے اور کیا واقعی ہماری ذاتی خودغرضی ہی دنیا کے جملہ عذاب کی جڑ ہے۔

خودغرضی کی تعریف اور اسکے معنی سادہ الفاظ میں "اپنی خواہش یعنی اپنی غرض کو کسی نہ کسی طرح دوسروں کو نقصان تک پہونچاکر بھی پورا کرنے" کے ہیں۔ خواہ وہ خواہش دولت کی ہو، شہرت کی ہو، حکومت کی ہو، کوئی بھی ہو، اور جب یہ اپنی خواہش یعنی اپنی غرض کی آگ تیز ہو جاتی ہے تو ہم دوسروں کے حق کو چھین کر اور دوسروں کو نقصان پہونچاکر اپنی غرض اور اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے کسی بھی ناجائز وسیلہ کو اٹھا نہیں رکھتے۔ اور یہ بات بھی سمجھنے اور یاد رکھنے کی ہے کہ جہاں خودغرضی کا بیج پڑتا ہے یعنی جہاں خودغرضی پیدا ہوتی ہے، اُگتی ہے، بڑھتی ہے اور اونچی جاتی ہے وہ جگہ ہمارا دل ہی ہے، اور اسکو سینچنے والی یعنی اسکی خوراک اگر کوئی شے ہے تو "جہل" ہے۔ اور میرے خیال میں اس بات کی بھی زیادہ تشریح اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے کہ خودی، خودپسندی، خودستائی، خودنمائی، خودپرستی اور انانیت یعنی اہنکار یعنی "میں"، "میرا"، اور "مجھکو"، وغیرہ سب خودغرضی کی مختلف صورتیں ہیں۔ اسی کے جداجدا رنگ اور ڈھنگ ہیں۔

خودی اور خودغرضی کا بیج انسان کے دل ہی میں اُگتا ہے۔ اسکی پتیاں اور شاخیں ہمارے اتنوں کی مختلف مختلف شکلوں میں پھوٹتی ہیں اور نکلتی ہیں اور ظاہر النظر آتی ہیں۔ اور پھر جسکے تلخ پھل رنج اور دکھ ہوتے ہیں اور جن کو

ہمکو اور ہمارے متعلقین کو اور ہمدردوں کو اور دنیا کو کھائے پڑتے ہیں۔ گویا بچے
جوان، بوڑھے، مرد اور عورت، بے لکھے پڑھے اور اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ، غریب اور
امیر وغیرہ قوموں کی قومیں اور ملک کے ملک اسی خودغرضی کے شکار نظر آتے ہیں۔
ایسی مثالیں خال خال ہی ملیں گی جن کے باطن خودغرضی سے بالکل پاک ہوں۔
یہ بھی ظاہر ہے کہ دولت، طاقت، خوبصورتی، شہرت، نیکنامی، حکومت،
اور علم وغیرہ کی خودنمائی اور خودستائی کے چکر میں تو بڑے سے بڑا انسان آجاتا
ہے۔ اور پھر جس خودنمائی اور خودستائی کے پھیر میں اور جس کے حصول
کے لئے وہ کیا کچھ نہیں کر گزرتا۔ ایمان اور انصاف کو بھی بالائے طاق رکھ دیتا ہے
اور پھر مکر، فریب، غارت اور قتل تک سے وہ باز نہیں آتا۔ مگر اسکی حکومت
اور طاقت اور دولت کی خودغرضی کو کسی طرح بھی سیری نہیں ہوتی۔ بلکہ جتنی
زیادہ کوششیں اور جتنی زیادہ تدبیریں اسکی سیری کے لئے کی جاتی ہیں اتنی ہی زیادہ
اسکی بھوک اور لالچ بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اور پھر اس خودغرضی اور ہوس کی نہ
کوئی انتہا رہتی ہے اور نہ اسکی گہرائی کی کوئی تھاہ ملتی ہے۔ ہزاروں ہی صورتیں
اور شکلیں عجیب وغریب نت نئی اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔

علاوہ بریں جیسے ایک بیج کے اندر ہی پتیاں پھول اور پھل سب ہی پوشیدہ
ہر وقت موجود رہتے ہیں مگر بیج کو دیکھنے سے وہ نظر نہیں آتے اور ان دونوں
یعنی بیج اور پھل میں علت اور معلول کا تعلق دائمی ہے اسی طرح خودی اور خودغرضی
انسان کے دل میں چھپی رہتی ہے اور نظر نہیں آتی مگر اسکے پھل یعنی نتیجے جلد برائیوں
اور خرابیوں اور تکلیفوں کی شکل علی الظاہر نظر آتے ہیں۔

خودغرضی کی دو قسمیں اور اسکے قیام کی جگہ

ہمکو اور آپ کو خودغرضی اور اُسکے قیام دونوں کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ اگر ہم اسکو دو قسموں میں تقسیم کر دیں۔

(۱) ایک تو وہ خودغرضی جو اسقدر باریک اور لطیف ہے کہ مشکل سے سمجھ میں آتی ہے۔

(۲) دوسری خودغرضی جو بالکل موٹی ہے یعنی کثیف ہے اور سامنے دکھائی دیتی ہے۔

لطیف خودغرضی

(۱) کیسا ہی تارک الدنیا ہو، بے طمع ہو، بے لاگ ہو اور بے نفس بھی ہو، اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک لفظ بھی اُسکی شان کے خلاف کہدیجئے تو وہ ماتھا سکوڑ لیتا ہے، چیں بجبیں ہو جاتا ہے، اسکے دل کے پردوں کے اندر چھپی ہوئی خودی یعنی انانیت یعنی اہنکار کو ٹھیس لگجاتی ہے اور وہ ابھر ہی پڑتی ہے۔ اور بعض تارک تو بگڑ ہی پڑتے ہیں اور جامہ سے باہر ہو جاتے ہیں اور جو جسمانی اور روحانی نقصان ان خود کو اور اُنکی ترقی کے رستہ میں جا ناک پہونچ جاتا ہے وہ بے اندازہ ہوتا ہے۔ اور جسکی اہمیت کو وہی لوگ بھی محسوس کرسکتے ہیں جو اس رستہ پر جاتے ہیں گویا اپنی انانیت یعنی خودی سے جو نقصان اور جو تکلیف دوسروں کو پہونچتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اپنے آپکو نقصان اور تکلیف پہونچتی ہے۔ خواہ اسکو ہم محسوس کریں یا نہ کیا کریں یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں اور قدرتی اور لازمی ہیں۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ ان لوگوں کی اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے اور جانتے ہوئے بھی ہم صرف اپنی ہی خودغرضی

کو پورا کرنے کی امیدیں ایسے لوگوں کو خدا رسیدہ اور پہنچا ہوا سمجھ بیٹھتے ہیں۔
جنھوں نے خودی، غصہ، حسد اور انانیت پر تک قابو نہیں پایا ہے۔ ابھی حال
کا واقعہ ہے کہ ایک شہر میں ایک باباجی تشریف لائے۔ انکی عقیدت میں لوگوں نے
اور پڑھے لکھے لوگوں نے ہزاروں روپیہ تحفوں وغیرہ میں انہیں صرف کیا۔ ایک
روز انکی تلقین یہ تھی کہ چمڑے کا استعمال نہ ہو، ایک نوجوان نے کہدیا کہ جس
مرگ چھالا پر آپ فروکش ہیں وہ بھی تو چمڑے ہی کی ہے۔ اور جو ڈھول وغیرہ آپ کے
یہاں بھجن کے گانے میں استعمال ہوتے ہیں انہیں بھی تو چمڑا لگا ہوا ہے۔ یہ سنتے ہی
باباجی جامے سے باہر ہو گئے اور اپنی زبان کو بھی قابو میں نہ رکھ سکے اور ہاتھا پائی
تک کر بیٹھے اور تارو ہو گئے۔

(۳) ان لوگوں کی ارادتاً چھپائی ہوئی خودغرضی کا کیا ٹھکانا اور کہاں تک اب تذکرہ
کیا جا سکتا ہے جو اپنے پیٹ پالنے یا اپنے نفس کی تمناؤں اور زیادتیوں کو پورا
کرنے کی خاطر ہزاروں گرو اور لاکھوں پجاری بنے ہوئے مندروں اور مسجدوں
اور گوردواروں کے مالک اور راہ نجات کے ٹھیکیدار بنے ہوئے فریب اور دھوکے
کی دکانیں سر بازار کھولے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ ماتھے
کو رنگ لینا، ہاتھ میں تسبیح یا مالا کا ہر وقت رکھنا اور چلانا یا بدن پر راکھ مل لینے یا
کسی عضو کو سکھا لینے کے معنی اپنے نفس اور خودی کو مار لینے کے نہیں ہیں۔ ہم یہ
سمجھتے ہیں کہ جو لوگ اپنی آنکھوں کو کسی نشہ یا دھوئیں سے سرخ کر لیتے ہیں وہ دھوکا
ہے وہ روحانی سرور کی گلابی نہیں ہے۔ باوجود اسکے ہم اپنے آپ کو دھوکا دیتے
ہیں۔ اور اپنی دولت اپنی عزت اور آبرو تک کو اور اپنی شخصیت کو ادب سے ہی کچھ کچھ

اُنکے حوالے کر دیتے ہیں۔ تو انہیں بھی صرف اپنی ہی خود غرضی مضمر ہے۔ کہ ہمکو تمنّا
ایسی چیز کی ہے جسکے ہم اپنے اعمال سے حقدار نہیں اور جن بنے ہوئے اور رنگے ہوئے
مذہبی پیشواؤں کے وجود کی ذمہ داری ہم انکے کے اندھے اور گانٹھ کے پورے
لوگوں ہی کی خود غرضی پر عاید ہوتی ہے کیونکہ ہم اُن سے اُن دنیوی ضروریات کی زیادہ
توقع کرتے ہیں جنکو ہم اپنی خود غرضی، کاہلی اور سستی کے باعث خود حاصل کرنے
میں گھبراتے اور بھاگتے ہیں۔ اور ہم اپنی نجات یعنی اپنی روح کی نجات کی بھی
بدون خود کچھ کئے دھرے یا اپنے ہاتھ پیر ہلائے اُن سے اپنی خود غرضی کے
باعث توقع کرتے ہیں کہ وہ لوگ ہمکو جنت میں پہونچا دینگے۔ حالانکہ کوئی انسان ایسا
نہیں ہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ خدا سے نزدیک تر اور کوئی شئے نہیں اور یہ کہ خدا
اسکے اندر موجود ہے۔ اور اگر اسکی جستجو اندر ہوگی وہ ملیگا۔ اور خدا سے
بدون خودی کے دور ہٹنے کوئی واصل نہیں ہو سکتا ہے۔ اور جو اس بات پر
کبھی یقین نہ کرتا ہو کہ چونکہ انسان کا دل ہی وہ آئینہ ہے جسمیں خدا اور اُسکا جلوہ
موجود ہے اسلئے دل ہی اسکا سب سے بڑا راہبر ہے۔ اور جو یہ نہ سمجھتا ہو کہ جیسے
بغیر خود کھانا کھائے ہوئے اپنی بھوک نہیں جاتی، جیسے بغیر خود پڑھے ہوئے
علم حاصل نہیں ہو سکتا اور نمک کے چکھنے سے زبان نمکین نہیں ہوتی اُسی طرح
بغیر خود کچھ کئے ہوئے یعنی بغیر خودی کو دور کئے ہوئے اور بغیر خود اس راستہ
پر چلے ہوئے یعنی تعلقات کو دل سے بغیر ترک کئے ہوئے یعنی یہ کیفیت پیدا کئے
ہوئے بغیر کہ دل کو کسی شئے سے نہ رغبت رہے نہ نفرت۔ اور بغیر دل کے
آئینہ کو پاک اور شفاف کئے ہوئے اور بغیر سکون قلب یعنی شانتی کا کیف

حاصل کئے ہوئے ہمارے دل میں اُسکے جلوے کا عکس نہیں پڑ سکتا یعنی ہمکو
روحانی آنند حاصل نہیں ہو سکتا۔ ان سب باتوں کو جانتے ہوئے بھی جو ہم بازیگروں
کی خود غرضیوں کا شکار ہو جاتے ہیں تو اسمیں بھی اپنی خود غرضی پوشیدہ ہے۔

مجھکو یہی یقین ہے کہ ہر کام میں خواہ وہ دنیوی ہو یا روحانی "اعتقاد" ایک
بادشاہ کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ بے لکھا پڑھا جسکو کسی انسان پر یا کسی شے
پر اگر مکمل اعتقاد ہے تو وہ زیادہ قابل قدر ہے بمقابلہ اُس عالم کے جسکی منطق نے
اُسکو ضعیف الاعتقاد اور ریاکار بنا دیا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ مریض کو شفا بغیر
حکیم پر اعتماد کئے حاصل نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایک طالب علم علم حاصل
نہیں کر سکتا جبتک کہ اسکو اپنے اُستاد کی علمیت پر اعتقاد نہ ہو۔ میں سمجھتا
ہوں کہ روحانی نجات کے لئے اپنے گرو یا پیر پر مکمل اعتقاد لازمی ہے۔ مرید یا چیلہ
کو اپنے آپ کو اپنے پیر یا گرو کو سونپ دینا ہوتا ہے۔ یعنی حوالہ کر دینا ہوتا ہے۔
مگر ان حقیقی اور سچے گروؤں اور پیروں میں سے وہ کتنے کم ہیں جو اپنے مریدوں
اور چیلوں کے اعتقاد کو پورا پورا اور انتہائی سے انتہائی حاصل کر کے اس کو اپنی
مٹھی ہی میں بند رکھتے ہیں اور اپنی مٹھی نہیں کھولتے یعنی اپنی مٹھی میں بند ہوا کو اُس
غیر محدود ہوا میں ملنے کا موقع بھی نہیں دیتے جو دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہے۔
یعنی اُس اپنے مرید کے اعتقاد کو خدا کی طرف اور خدا کو منتقل نہیں کر دیتے۔
بلکہ منتقل کرنا گوارا ہی نہیں کرتے کیسی بڑی بڑی روحانی ہستیوں میں بھی خودی بھی
چھپی رہتی ہے جو طاقتور خوردبین سے بھی نظر نہیں آتی۔ کیونکہ
یہ لوگ عام طور پر اپنے مرید کو یہ بتلا دیتے اور سمجھا دیتے ہیں بھی درگزر کرتے

ہیں کہ انکو خود بھی پیدا کرنیوالی کوئی اور طاقت ہے۔ اور دوسرے یہ بھی اپنے
چیلوں کو بالکل ہی نہیں سمجھاتے کہ جو بھی روحانی طاقتیں انہیں اگر ہیں خواہ وہ
کراماتوں کی صورت میں ہوں یا معجزوں کے مانند ہوں، خواہ وہ الہام کی طرح ہوں
کہ جو کچھ بھی انکے منہ سے نکلا وہ بھی ظہور میں آیا خواہ انکی وہ طاقت جس نے
کسی کو تاریک سے تاریک وقت میں روشنی دی ہو، یا کسی کو کسی مصیبت یا مہلک
بیماری سے بچایا ہو یا پھانسی کے تختہ پر سے اتارا ہو، یا کوئی اور بخشش اولاد، زر یا
عہدہ کی کیوں نہ دی ہو تو وہ انکی جملہ روحانی طاقتیں اگر حقیقتاً کچھ ہیں تو اول
تو انکی وہ حاصل در ذاتی یعنی انکی اپنی ملکیت نہیں ہیں بلکہ انکا عطیہ خداوند
عالم کی جانب سے تقریباً ہر ایک میں اور ہر قدم میں اور ہر زمانہ میں کسی ایک نہ ایک
کو دیا جاتا یا گیا ہے اور اب بھی دیا جاتا ہے اور آئندہ بھی دیا جائیگا۔ اور
دوسرے یہ بات بھی وہ لوگ اپنے چیلوں کو نہیں بتلاتے کہ جس طرح جیسے
چھوٹی سے چھوٹی کرن بھی آفتاب ہی سے آتی ہے۔ اور ایک چھوٹی سی چھوٹی
بوند بھی دریا اور سمندر کا ایک حقیر حصہ ہے۔ اسی طرح انکی یہ سب روحانی
طاقتیں اور گیان وغیرہ سب ہی صرف حقیقتاً اسی کی بخششیں اور اسی کے
کرم اور عطیے ہیں اور اسی کے حقیر حصے ہیں۔ جو دنیا کی تمام طاقتوں، تمام
گیانوں، نیکی، رحم و کرم، انصاف، سچائی اور آنند کا لا محدود مخزن اور
بے پناہ بھنڈار ہے۔ اپنا تو کچھ بھی نہیں۔

(۳) روزمرہ کے تجربہ کی بات ہے کہ پوجا کرتے یا نماز پڑھتے وقت
یا جب ہم کسی کے ساتھ لکھ رہے ہیں یا پڑھ رہے ہیں یا کسی فلسفہ یا سائنس

کی تحقیقات میں مصروف ہیں تو اسوقت اگر گھر کے بچے بھی کھیلتے دوڑتے اور
شور مچاتے ہیں تو اکثر لوگ یا تو پوجا اور نماز کے درمیان ہی بول اور چلا پڑتے
ہیں۔ یا اُنکو خاموش ہوجانے کے لئے صرف اشارہ ہی کردیتے ہیں اور نہیں تو پوجا
کے دو اکثر جاتے کے باہر ہوکر نہ معلوم کیا کچھ کہہ گزرتے ہیں۔ بھلا یہ کیا وحشت
ہے۔ حالانکہ حقیقت میں تو وہ اسکی رحمت ہے۔ مجھکو بھی اسبات کا ایک بار ذاتی
تجربہ ہوا جبکہ میں پوجا دھیان کے شغل میں مصروف تھا۔ ادھر تو بچوں نے کھیل
کود اور شور مچایا اور ادھر لوگوں نے کسی بات پر چلانا شروع کیا۔ مجھکو فوراً کچھ غصہ آیا
مگر میں نے اُسکو روکا۔ اور اسکے رکتے ہی میں نے غور کیا۔ اور بہت سی باتیں
میری آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ گویا خدا کی رحمت ہی نازل ہوگئی۔ میں نے
سوچا کہ یہ تو میرے اختیار کی بات ہے کہ اپنے بچوں اور نوکروں کو میں ڈانٹ
اور دھمکا سکتا ہوں، مگر یہ چڑیاں جو بول رہی ہیں۔ اور گھنٹے جو باہر بجوا رہے
ہیں۔ اور بہت اقسام کی زور زور کی آوازیں جو آرہی ہیں اُنکو تو میں روک
نہیں سکتا۔ اور جب باہر کی آوازوں سے میری پوجا میں خلل ہونیکا خیال
مجھکو نہیں آتا تو گھر کے بچوں کی آواز سے یہ خیال خلل اندازی کا کیوں
پیدا ہو۔ یہ تو محض اپنے بس اور بیبسی کا سوال ہے۔ جب میں اُنکو منع نہیں
کرسکتا تو اِنکو کیوں منع کردوں اور بُرا بھلا کہوں۔ اور پھر ساتھ ہی خیال
آیا کہ اگر میں ان بچوں کو اپنی پوجا کے وقت کھیلنے کودنے سے روکتا ہوں تو گویا اس
قوت کی بنا پر کہ میں گھر کا بڑا ہوں۔ اور میں ان کے ایک قدرتی اور جائز حق کو
ناجائز طریقہ پر چھینتا ہوں جسکا مجھکو کوئی حق نہیں اور پھر پوجا اور شور دونوں کا ہے

گھر میں ہونا ہے تو روز کی بات ہے۔ ایک روز مان جائینگے دوسرے روز مان جائینگے
آخر تک کچھ ہی ہیں نہیں تو پھر مار پیٹ کی نوبت آئیگی۔ تیسرے میں نے قطعی فیصلہ
کیا کہ ایمان اور انصاف کی بات تو یہ ہے کہ وہ اپنا کام کریں اور میں اپنا کروں۔
چوتھے میں نے یہ بھی غور کیا کہ شغل میں اپنی وہ توجہ اپنی یکسوئی ہی کیا جو اس
شور سے ٹوٹ جائے اور اسکی پابند رہے۔ پانچویں واقعہ ہے کہ میں نے یہ بھی
غور کیا کہ یہ تو بہ باتا کی کرپا ہے اور اسکا فیض ہے اور اسکی خوشی ہے بلکہ اسکا
حکم ہے کہ میری توجہ اور میری یکسوئی کی روزمرہ جانچ پڑتال اور اسکی پختگی انھیں
کے وسیلے اور عنایت سے ہو اسکے جنکو اس نے میرے پاس اور میرے ہی
گھر میں رکھا ہے۔ اس اپنی بپتا اور مہ تذکرہ سے میری غرض یہ نہیں
ہے کہ میرے ناظرین مجھکو کچھ سمجھیں بلکہ ان کے یقین کو زیادہ پختہ کرنا میرا
مدعا تھا۔ اور جسکو میں نے ایک سچے اور ذاتی واقعہ میں پیش کیا ہے۔ اور
میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ اس دن سے آجتک کوئی شور کی بات چیت اور کوئی
باجا یا گانا میرے شغل پیٹھ کے اور خیال کا مون میں خلل نہیں ڈالتا۔ بلکہ اگر لوگ
اپنے بچوں کی سمادھ میں ڈانٹتے یا مارتے ہیں تو میرے دل کو چوٹ لگتی ہے۔
مطلب یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر وہ پوجا کرتے ہیں تو گویا کسی پر
احسان کرتے ہیں اور اسلئے وہ یہ توقع کرتے ہیں کہ اسوقت نہ کوئی بولے اور نہ
کوئی کچھ کرے۔ گویا پوجا کیا ہے کوئی مہم ہے اور کوئی آفت ہے یا کسی بادشاہ
کی سواری آتی ہے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ اس پوجا اور خدا کی عبادت تک
میں ہماری خودی اور انانیت کیسی چھپی ہوئی ہے جو ذراسی ٹھیس سے بھی پھوٹ

پڑتی ہے اور جب کہ نتیجے میں اپنی ہی نیت بگاڑ دیں کے نتیجے میں پریشانیاں کتنی اور نقصان دہ ہوتے ہیں۔

(۴) دنیا میں اور بالخصوص ہندوستان میں بھی ہزاروں اور لاکھوں لوگ راہِ حق پر ہزاروں اور لاکھوں کی خیرات کرتے ہیں، مندر اور مسجد اور گرجے بنواتے ہیں۔ سرائے اور دھرم شالے بنواتے ہیں اور تعلیم گاہوں، ہسپتالوں، یتیم خانوں وغیرہ میں بیکراں دان دیتے ہیں۔ مگر ایسا اکثر اوقات آپ نے دیکھا ہوگا کہ ان لوگوں کے دل میں بھی شہرت یا نیکنامی کی غرض یا خودی چھپی رہتی ہے۔ اور ایک سفید چادر پر ایک بدنما دھبہ لگ ہی جاتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا کو روشنی دکھانے والوں نے ہدایت کی ہے کہ نیکی کرو اور دریا میں ڈال دو۔ داہنے ہاتھ سے اس طریقہ پر خیرات کرو جو بایاں ہاتھ بھی نہ دیکھ پائے تاکہ خیرات کرنے والوں کے دل کے شفاف آئینہ پر خود نمائی اور خودستائی کا ہلکا سا بھی داغ نہ لگنے پائے مگر یہ خود نمائی اور خودی کسی نہ کسی شکل میں ایسے بڑے بڑے دانیوں کے دل میں بھی چھپی رہتی ہے۔

(۵) جو لوگ خدمتِ خلق یا خدمتِ ملک اگر بےلوث کرتے ہیں تو وہ اپنے ملک اور دنیا دونوں میں آفتاب درخشاں کی طرح چمکتے ہیں اور ملک و دنیا دونوں ہی کو روشنی دیتے ہیں۔ اور ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جنہوں نے ملک کی آزادی یا ترقی کے لئے کتنے ہی بڑے ایثار اور قربانیاں کیوں نہ کی ہوں اگر ان کے ایثار اور قربانی میں رتی بھر بھی خودغرضی شامل رہے تو وہ نہ صرف اپنے مشن میں فیل ہو جاتے ہیں بلکہ

اُنکو بات بات اور قدم قدم پر منھ کی کھانی پڑتی ہے۔

ہندوستان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ ہندوستان کی آزادی
کی گزشتہ خاموش جنگ میں ہزاروں اور لاکھوں بھائیوں نے اپنے نفس،
جان اور مال کی سب کچھ حیرت انگیز اور لامثیل قربانیاں کیں۔ اور کیا کیا
ناقابل بیان تکلیفیں برداشت کیں۔ مگر جس ایثار کرنے کے بعد کیا کچھ ایسے
لوگ نہیں ہیں جن کے دلوں میں اُس ایثار کی انانیت نہ آگئی ہو۔ اور ذاتی
شہرت، یا ذاتی نیک نامی یا ذاتی قوت حاصل کر لینے یا صف اوّل میں آجانے
کی تمنا نہ آگئی ہو۔ اسکا اندازہ صرف اسی بات سے لگے گا اگر آپ غور کریں
کہ وہ کتنے اور کون کون ہیں جن کے دل اب خودی، خودستائی یا خودنمائی سے
پاک ہیں اور جنکا یہ یقین ہے کہ ہم نے اُس فرض کو ادا کیا جو ہمارا فرض مادر وطن
کے ساتھ تھا اور جو اس ایثار کے عوض میں عہدہ داری اور منصب کے پھیر
اور فکر سے پاک ہیں۔ اور پھر جس عہدہ داری کے حاصل کرنے کے لئے
وہ زمین اور آسمان ایک نہیں کر رہے ہیں۔ اور جائز و ناجائز سبھی طریقوں کو
ظاہرا اور خفیہ برت نہیں رہے ہیں۔ میں اس حساب کو ناظرین کے شغل
اور فکر کے لئے چھوڑتا ہوں کہ وہ ہر ایک انجمن کے ہر ایک رہنما کو اور
ہر ایک انجمن یا سرکاری بڑے بڑے عہدہ داروں، وزیروں، ججوں،
اسکولوں اور کالجوں کے ماسٹروں اور پروفیسروں، اڈیٹروں مصنفوں
وغیرہ سب ہی کو اس کسوٹی پر کسیں اور غور کریں۔ اور فیصلہ دیں کہ کس کس نے
اپنے ایثار میں، اپنی تقریر اور تحریر میں، اپنے عہد حکومت میں اور اپنے اپنے

کاموں میں اور اپنے اپنے جملہ افعال میں جو کچھ وہ بولتے یا لکھتے یا کرتے ہیں۔ جسکا تعلق اس ذمہ داری سے ہے جو انھوں نے اپنے ذمہ لی ہے۔ انکو انھوں نے اپنا ملکی اور اپنے عہدہ کا فرض سمجھکر کیا ہے یا کرتے ہیں۔ یا اسمیں کوئی لگاؤ اپنی شہرت یا اپنی نیکنامی یا اپنا وقار اور اقتدار اسکے اظہار یا پوزیشن کو اونچا کرنے اور صرف اپنی تنخواہ میں ترقی یا عہدہ داری حاصل کرنے کی یا صرف پیسہ پیدا کرنے کی غرض اپنی خود غرضی بھی شامل ہے۔ ہمکو یقین ہے کہ سیکڑوں میں سے دو چار ہی ایسی ہستیاں ملیں گی جن کے دل خودی یا خودستائی، یا خودنمائی سے پاک ہوں۔ اور جب ہو زون نہ ہوگا اگر میں اپنے پیارے ناظرین سے بھی یہ توقع کروں کہ وہ خود بھی اپنے آپکو اس کسوٹی پر پرکھا کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ خدمت انسان یا خدمت خلق وہی ہے جسمیں اپنی کوئی خودی یا خودنمائی یا خود غرضی شامل نہ ہو۔ یہ تو دل کے اندر ونی سے اندرونی پردہ میں چھپی بیٹھی رہتی ہے۔ اور اسکا جب پتہ لگتا ہے جب یہ دفعتہً کھٹ سے باہر نکل آتی ہے۔ بات تو چھوٹی ہے مگر چھوٹی چھوٹی باتوں سے اکثر بڑے بڑے اصول کھلتے ہیں۔ اور اپنا اور دوسروں کا لاجبر پتہ چلتا ہے۔ حال ہی ہمارے ایک ملنے والے ہمارے یہاں مہمان تھے۔ باہر جاتے ہوئے انھوں نے مجھسے کہا کہ میں ملازم سے کہدوں کہ انکا رومال دھوکر سکھا دے۔ مجھکو خود بھی اپنے موزے دھونے تھے۔ میں نے انکا رومال بھی خود ہی دھو دیا۔ مگر شام کو دوران گفتگو میں اس اظہار خودنمائی سے میں باز نہ رہ سکا اور میرے منھ سے نکل ہی گیا کہ آپ کا رومال میں نے خود ہی دھویا تھا۔ اور اپنی چھوٹی سی خدمت کو

بھی اپنی ماں کی ترتیب سے آلودہ کر ہی لیا - میں خود بھی سبق آموز ہوا، اور
ناظرین بھی سبق آموز ہوں - کہ خدمتِ انسان وہی ایک خدمت ہے جس میں کوئی لگاؤ
نہ ہو - یعنی جس سے کچھ ظاہر ہونے یا ظاہر کرنے کی غرض شامل نہ ہو - بلکہ کوشش
تو یہ ہو کہ جس میں انسان کی خدمت کی جائے اُس تک کو معلوم ہی نہ ہو کہ اسکی خدمت
کس نے کی -

کشف یعنی موٹی خود غرضی کی ابتدا

اپنے اپنے سنسکاروں اور طبیعتوں کے باعث "میں" "میرا" اور
"مجھکو" یہ تینوں اوائل عمر ہی سے کسی نہ کسی صورت میں نمودار ہو جاتے ہیں -
یہ عام انسانی خاصہ ہے کہ جہاں کسی بچہ کو یہ خیال پیدا کرایا گیا یا ہو گیا کہ ماں میری
ہی ہے - یا باپ میرا ہی ہے تو اُسکے دل میں اپنے بھائی بہنوں سے رقابت
کے بیج پڑ جاتے ہیں - وہ رقابت اکثر اوقات آپس میں دھینگا مشتی کی باعث
ہو جاتی ہے - ممکن ہے کہ رقابت کا بیج اسوقت نشو و نما نہ پائے - مگر عمر
پاکر آپس کی دشمنی جنگ و جدل میں نمودار ہوتی ہے - جس بچہ کے دل میں جب
"میں" اور "مجھکو" ابھرتی ہے تب وہ مچلتا ہے کہ جو مٹھائی یا پھل یا کھلونے
یا کوئی چیز گھر میں آتی ہے یا تو سب ہی اسکو دیدی جائے یا کم از کم سب سے
زیادہ اُسی کے حصہ میں آئے - اگر اس بچہ میں سمجھ بوجھ ہے تو اکثر دیکھا گیا
ہے کہ وہ آنکھ بچا کر کبھی کھا لیتا ہے اور باز پرس ہونے پر صاف انکار کر جاتا ہے
اور کسی اپنے بھائی یا بہن یا کسی نوکر کو اُلٹی تہمت لگا دیتا ہے - گویا جو بچہ

بھی کسی ناحق بات کے کرنے یا مغالطہ یعنی دھوکا دینے یا لڑنے جھگڑنے یا جھوٹ بولنے یا بلا اجازت کسی شئے کو لینے پر آمادہ ہوتا ہے تو یہی خود غرضی کی وجہ جو اسکے دل میں اپنے سنسکاروں اور طبیعتوں کے باعث از خود پیدا ہوئی ہے یا اُسکے والدین نے پیدا کر دی ہے۔ اور پروانی تمثیل سے بھی یہ ثابت ہے کہ ہر ایک بُری عادت کی اصلی جڑ خود غرضی ہے۔ جو بھولے ماں باپ ہیں وہ اس "میں" یا "میرے" اور "مجھکو" کے بیج کو اپنے بچوں میں نفع عقل اور محبت کے ذریعہ نشو و نما ہونے ہی نہیں دیتے۔ بچوں کا اسکا گمان تک نہیں ہونے پاتا۔ مگر جو لوگ بے سمجھی سے اور جبر و تشدد سے کام لیتے ہیں، ممکن ہے کہ وہ فوری علاج ہو مگر پیچھے پھر وہ عادت اور زیادہ طاقت کے ساتھ اور اور زیادہ شکلوں میں نمودار ہوتی ہے۔

جبکہ خود غرضی کے بیج بچپن ہی سے دلوں میں اچھا کھیلیا اور ان کی نشو و نما ہونے لگتی ہے تو جوانی کے وقت میں وہ درخت پھیل جاتی ہے۔ اور ہم وہ خیال اور وہ باتیں اور وہ فعل ہی زیادہ پسند کرتے ہیں جن میں کوئی نہ کوئی غرض شامل نہ ہو۔ اور پھر یہی ناکس تو ہیں اور ملک خود غرضی کو اپنی زندگی کا کھانا بنا لیتی ہیں۔

خود غرضی کا پھیلاؤ

بڑے بڑے شہنشاہوں، بادشاہوں، مہاراجوں، راجوں، وزیروں، ٹھاکروں، تاجروں اور اصلی سے اعلیٰ التعلیم یافتہ اور مہذب طبقے کے لوگوں، فلاسفروں، مذہبی پیشواؤں سے لیکر ادنیٰ سے ادنیٰ اور غریب سے غریب

انسانوں میں لاکھوں میں شاید موجودہ زمانہ میں سو پچاس ایسی بزرگ ہستیاں ملیں جنکے خیالات اور افعال دونوں ہی خودغرضی سے پاک ہوں ورنہ خودغرضی کسی نہ کسی شکل میں ہر کس و ناکس کے دلمیں اور سراپا برائی اور سراپا تکلیف کی تہ میں پائی جاتی ہے۔ تقریباً ہر شخص اپنی شخصیت کو اپنے وقار و اقتدار کو اور اپنی شان و شوکت کو اور اپنی بات کو اونچے سے اونچا رکھنے اور اپنے نام کو ہمیشہ قائم رکھنے اور اپنی شہرت کے لئے اور دنیا بھر کی دولت اکٹھی و سمیٹ لے اور اسکے جملہ سامان کو اکٹھا کرنے میں غرضیکہ "میں" "میرا" اور "مجھکو" ہی کے چکر میں کیا کچھ نہیں سوچا کرتا - کیا کچھ نہیں کہتا سنتا اور کیا کچھ نہیں کر گزرتا - علاوہ بریں جتنے بھی جرائم زن، زمین اور زر یا اور دیگر وجوہ کے باعث سرزد ہوتے ہیں اگر انکی ابتدا دریافت کیجائے تو معلوم ہو جائیگا کہ وہ بجز دوسروں کے حق سلب کر لینے اور خودغرضی کے علاوہ اور کچھ نہ تھی - واقعہ یہ ہے کہ خودغرضی انسان کو قطعی اندھا کر دیتی ہے اسکی عقل اسکی رواداری، اسکا انصاف اور اسکا ایمان بلکہ اسکی انسانیت تک جاتی رہتی ہے اور یہ کیفیت قوموں اور ملکوں کی بھی ہے۔

خودغرضی کا سبب جہل ہے

جسطرح درخت کی جڑیں زمین کے اندھیرے گپ میں ہی اپنی اس خوراک کو ڈھونڈتی ہیں جو درخت اُن سے طلب کرتا ہے اُسیطرح خودغرضی جو دنیا کی تمام تکلیفوں اور برائیوں کی جڑ ہے۔ وہ بھی جہل کی تاریکی کے سہارے کبھی نہ بھرنے والے اپنے پیٹ کو سیر کرنے کی کوشش میں انسان کو ہمیشہ اسکی تمام

زندگی بےچین اور بیقرار رکھتی ہے۔ جہالت اور جہل اسکی خوراک ہیں۔ انہیں پر اسکی بسر ہے۔ اور انہیں پر وہ پھلتی اور پھولتی ہے۔ خودغرضی جہاں خود اندھی ہے وہاں اسکی زیست بھی اندھیر اور کورانہ جہالت پر مبنی ہے۔ یہ خودغرضی اور جہالت دونوں ہی نہ کسی قانون کو مانتی ہیں اور نہ کسیطرح کسی رواج اور نہ کسی سمجھ کی پابند ہیں۔ دونوں ہی بےسری ہیں بلکہ مجسم اندھیر ہیں۔

جہل کیا ہے؟

جہالت کے معنی علم یعنی گیان نہ ہونے کے ہیں۔ اور علم یعنی گیان کے معنی جاننے کے ہیں۔ اور جاننے سے مطلب کتابوں کے پڑھ لینے کے ہی نہیں ہیں۔ بلکہ جاننے کا مطلب یہ ہے کہ ہم (۱) نیکی اور بدی (۲) سکھ اور دکھ اور (۳) حق اور ناحق کو جانیں اور انہیں تمیز کر سکیں اور تمیز کر لینے اور دونوں میں فرق سمجھ لینے کا مطلب یہ ہے کہ (۱) بدی نہ کریں بلکہ نیکی کریں (۲) وہ افعال نہ کریں جن سے کسی کو دکھ یعنی ایذا پہونچے۔ بلکہ وہ افعال کریں جن سے سب کو سکھ ہو۔ اور (۳) جو اپنا حق ہو اسی پر قانع رہیں اور دوسروں کا حق نہ لیں بلکہ جسکا جو حق ہے اسکو دیں۔ اسلئے علم کے حقیقی معنوں کو سمجھتے ہوئے اور علم کے حقیقی اصول اور معیار کو قائم کرتے ہوئے ہمکو اس حقیقت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ حقیقت میں دنیا بادی النظر میں اسوقت باوجود جملہ علوم و فنون کے اونچی سے اونچی چوٹی پر پہونچے ہونے کے بھی آیا علم کے معنی سمجھتی ہے اور اسکے معنوں پر عامل ہے اور اسکے معیار پر کاربند ہے یا جہالت اور جہل کے

قعر ذلت میں گری ہوئی ہے ؟

روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جو ایک ایک دوسرے سے جنگ کرتے ہیں
اور وہ جنگ بھی جو اس وقت یورپ میں ہو رہی ہے۔ اور جس کے تمام دنیا میں
پھیل جانے کا اندیشہ ہے۔ کیا اس کا سبب جہالت اور خود غرضی نہیں ہے؟
کیا جو علم انھوں نے حاصل کیا ہے اس کا منشا یہی ہے کہ بجائے دوسروں کو
اُن کا حق دینے کے ان کا حق چھینیں۔ بجائے دوسروں کو سکھ پہونچانے
کے ان کو ایذا پہونچائیں اور بجائے نیکی کے بدی کریں ؟

جو جو بھی اوتار، پیغمبر اور رشی منی دنیا میں آئے اور جو کچھ بھی انھوں نے تلقین
کی اور جو بھی مذہب انھوں نے قائم کر دیا تو اس کی غرض یہی تھی کہ سب کے ساتھ نیکی
کرو۔ سب کو سکھ پہونچاؤ۔ اور کسی کا حق بھی نہ لو۔ مگر کیسے غضب کی جہالت
ہے کہ آج مذہب کے نام پر لوگ بجائے ... کے نام پر دنیا میں اور خاص کر
ہندوستان میں تباہی اور فرقہ وارانہ لڑائیاں اور قتل و غارت اور بد تمیزی
اور خونریزی کے ساتھ ہو رہے ہیں؟ کیا یہ اندھیر اور جہالت نہیں ہے؟
کیسے غضب کی جہالت اور اندھیر یہ بھی ہے کہ ہم دنیا بھر اور خاص کر
ہندوستان میں یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو کروڑوں مرد اور عورت اور
بچے تک ایک وقت کی سوکھی روٹی تک کو محتاج ہیں۔ جن کے تن کو ایک کپڑا
تک میسر نہ ہو۔ اور دوسری طرف ایسے لوگ بھی کافی تعداد میں ہیں جن کے
پاس انکی ضروریات زندگی سے کہیں زیادہ اربوں اور کروڑوں روپیہ
ہو اور جسکو وہ زیادہ تر اپنے ہی ذاتی آرام اور عیش و عشرت میں صرف

کرتے ہوں۔ اور اپنے ہی شہر ملک اور دنیا کے ہم وطن بھوکوں اور ننگوں کی
تکلیف کا انکو احساس تک نہ ہو۔ اور پھر ایسے لوگوں کی خصوصاً ہندوستان
میں کمی نہ ہو جو اس دولت کو نہ اپنے اوپر اور نہ اپنے لواحقین کی بہتری
پر صرف کرتے ہوں اور نہ اور لوگوں کو اس سے مستفید ہونے دیتے
ہوں۔ بلکہ اس دولت کو اور زیادہ بڑھانے میں دن و رات لگے رہتے
ہوں۔ اور جس کے حصول کے لئے وہ ہر عنوان کے مکر و فریب کو بھی
روا رکھتے ہوں۔ یہ جہالت تو بالکل ہی بے سمجھ جانوروں اور درندوں
کی ہے۔ جو نہ خود کھاتے ہیں نہ دوسروں کو کھانے دیتے ہیں۔
کیا اسی کا نام گیان یا علم ہے؟۔ کیا اس علم کا یہی نتیجہ ہے جو انھوں
نے حاصل کیا ہے؟۔

خودغرضی کا سبب افراط ہے نہ کہ تفریط

اس بات سے ہم ایک اور نتیجہ پر آتے ہیں اور وہ کیسی حیرت انگیز
بلکہ الٹی سی بات ہے۔ کہ دنیا میں آپا دھاپی رقابت اور نفسا نفسی یعنی
خودغرضی کا سبب افراط ہی ہے نہ کہ تفریط۔ کیونکہ دیکھنے میں یہ آرہا
ہے کہ اگر کسی انسان یا قوم یا ملک کے پاس اسکی روزمرہ کی ضروریات
سے زیادہ دولت اور طاقت ہے تو پھر اسکو اور زیادہ دولت اور
طاقت کی سوجھتی ہے۔ اور اسکی ہوس بڑھتی ہوئی آگ کی طرح بھڑکتی
بڑھتی ہی جاتی ہے۔ اور جب ہوس یعنی خودغرضی کے بس ہوکر وہ انصاف

اور حق اور رواداری کے خرمن کو خاک سیاہ کر کے مٹی میں ملا دیتی ہے۔
نا سمجھ چڑیوں اور کبوتروں میں بھی یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جبتک اُن کا
پیٹ نہیں بھرا ہے وہ صبر اور تحمل کے ساتھ دانہ چگتے رہتے ہیں۔ مگر
جہاں اُنکا ذرا بھی پیٹ بھرا تو اُنمیں آپس میں لڑائی شروع ہو جاتی ہے۔
اور لہولہان کی نوبت آجاتی ہے۔ اور کچھ کے پیٹ جب اسقدر بھر جاتے
ہیں کہ اُنمیں ایک دانہ کی گنجائش بھی نہیں رہتی تو وہ اپنے سامنے کے دانوں
پر مستانہ وار اور سرمایہ دارانہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دانوں کے چاروں طرف
چکر لگاتے ہیں۔ اپنی بولی میں دوسروں کو للکارتے ہیں اور کسی دوسرے
کبوتر کو اپنے دانوں کے پاس آنے تک نہیں دیتے۔ اور جو آ بھی گیا تو اُسکو
چونچ مارتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ جب چڑیاں اپنا
منہ بھر لیتی ہیں تو اِدھر اُدھر دیکھتی بھی جاتی ہیں۔ کیونکہ اُنکو یہ خوف لاحق ہوتا
ہے کہ کہیں دوسری چڑیا اُن کے سامنے کے دانوں کو ہڑپ نہ کر جائے۔

بجنسہ یہی کیفیت فی زمانہ انسانوں۔ قوموں اور ملکوں کی بھی ہے۔
بڑے ملکوں کو تو چھوٹے ملکوں کو لے لینے کی ہوس ہر وقت دامنگیر رہتی ہے۔
اور چھوٹے ملکوں کو بڑے ملکوں کے حملوں کا خوف ہر گھڑی رہتا ہے۔ گویا
دونوں ہی کو اس خود غرضی کی بدولت چین نہیں۔

اگر کسی شہر میں طاعون یا ہیضہ ہو جائے یا زلزلہ آجائے یا ڈاکوؤں اور
چوروں کا زور ہو جائے یا کوئی جنگ ہی ہو جائے۔ یا کوئی ایسی آفت ناگہانی
آجائے جسکا اثر امیر اور غریب دونوں پر یکساں پڑے تو پھر دیکھئے آپس کی

ہمدردی اور محبّت اور رواداری سب ہی کچھ ابھر آتی ہے۔ بیہودہ سرمایہ دار انسان
جسکی جہالت سے آنکھیں بند ہیں وہ حق اور ناحق میں اور نیکی اور بدی میں تمیز
نہیں کرتا۔ اور جو خود غرضی کے نشہ میں چور ہے اور جسکی دولت اسکی ضروریات
سے زائد ہے اور جس وجہ سے نفس پرستی اور عیش و عشرت اور آرام اسکی
زندگی کا شیوہ اور معیار بن گئے ہیں اور اس معیار کو قائم رکھنے کے لئے
اور کبھی نہ بجھنے والی ہوس کو بجھانے کے لئے جو بجھنے کے بجائے اور بڑھتی
ہی جاتی ہے وہ اپنی دولت کو اور بڑھانے کے چکّر میں رہتا ہے اور دنیا بھر کی
آپا دھاپی اور رقابت مکر و فریب کو جائز سمجھتا ہے۔ اس بات سے بھی
یہ ثابت ہوتا ہے کہ دنیا کی کشمکش اور رقابت کی وجہ اصل میں افراط ہی
ہے نہ کہ تفریط۔

اسی طریق پر جو ملک طاقتور ہیں اور جو اپنی طاقت کے نشہ میں چور
ہیں اور جنکی بے انتہا دولت اور بے انتہا طاقت کی وجہ سے اُن کے
باشندوں کے معیار زندگی باقیوں سے اونچے ہو گئے ہیں وہ اُنکو قائم رکھنے
کے لئے اور جہل کی وجہ سے کبھی نہ بجھنے والی ہوس اور نہ سیر ہونے والی خود غرضی
کو پورا کرنے کی غرض سے اپنی دولت کو اور بڑھانے کے لئے کمزور
ملکوں پر اپنا قبضہ جمانے کی گھات میں لگے رہتے ہیں۔ اور یہ اپنی بدانتظامی
تجارتی بددیانتی۔ اور توہین وغیرہ کے الزام اُن کے سر تھوپ کر اُن پر حملہ آور
ہو جاتے ہیں۔ اور اُنکو اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ جسکی مثالیں یورپ اور ایشیا
دونوں میں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ اور چھوٹے ملکوں کی

زندگی تو ہر وقت خطرہ اور تنگی میں گزرتی ہے۔

امپیریلزم یا سرمایہ داری کے معنی اصل میں خود غرضی کے ہیں!

میں امپیریلزم یعنی سامراج یا سرمایہ داری کے معنی انتہائی خود غرضی کے سمجھتا ہوں جس کا سب سے زیادہ بھیانک روپ ایک غلام ملک میں دکھائی دیتا ہے۔ نہ صرف ہندوستان کی گزشتہ تاریخ اور موجودہ حالات بلکہ یورپ اور ایشیا اور امریکہ کے ملکوں کے بھی گزشتہ اور موجودہ واقعات پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ صرف دولت کی غرض سے فاتح ملک مفتوح ملک یا قوم کو ہمیشہ غلام رکھنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اور پھر جسکے لئے وہ کیا کچھ نہیں کرتا۔ سرمایہ دار حکومت کے ہر ایک رویہ میں، ہر ایک چلن اور ہر ایک پالیسی کی تہہ میں اور ہر ایک فعل میں خواہ بادی النظر میں وہ کتنا ہی خوشنما کیوں نہ ہو۔ صرف اندھی خود غرضی چھپی رہتی ہے۔

جبکہ یہ امر مسلمہ ہے کہ ایک بیج یعنی علت کے ہزار ہا شکلوں میں منقول ہو جاتے ہیں اور جو شمار کے باہر ہوتے ہیں۔ تو پھر ان زیادتیوں اور بے عنوانیوں اور ان پالیسیوں کا اندازہ اور شمار ہونا کیونکر ممکن ہے جنکو اپنی خود غرضیوں کو پورا کرنے کے لئے ایک سرمایہ دار ملک عمل میں لاتا ہے۔ مفتوح ملک کے مذہب تمدن، تاریخ اور اسکی زبان اور اسکے جملہ علوم و فنون کو ملیا میٹ کر کے اسکے باشندہ و نیز ہر ایک فرد کی شخصیت ہی کا خاتمہ کر دینے کے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے

اپنی زبان کی اور اپنے قانون، اپنی تہذیب، عدالت، پولیس اور ریلوے وغیرہ کے ذریعہ اُس قوم کے دلوں، اُمنگوں اور وطنیت اور یکجہتی کو کچل دینے اور مار دینے کو جائز سمجھتا ہے۔ اور اُنکو قانون اور تلوار دونوں کے ذریعہ اُبھرنے ہی نہیں دیتا۔ اُسکی تجارت کو ہر جائز اور ناجائز طریقہ پر ختم کر کے اپنی تجارت کو قائم کرتا ہے۔ چوٹی کی ملازمت پر اپنے ہی ملک والوں کو مقرر کرتا ہے۔ اپنے ہی ملک والوں کی فوج رکھتا ہے۔ اور ان سب ذریعوں سے اسکی دولت کو چوس لینا اپنا حق سمجھتا ہے۔ یہانتک کہ جو کام وہ رفاہ عام کے نام پر بھی کرتا ہے مثلاً ہسپتال اور تعلیم گاہیں وغیرہ بھی جو جاری کرتا ہے اُن میں بھی اپنے مال بکنے اور اپنے ملک والوں کی بڑے بڑے عہدوں پر ملازمت کی خود غرضی پنہاں رہتی ہے۔ غرضیکہ وہی کورانہ خود غرضی اُسکے ہر فعل میں نظر آتی ہے کہ ہم زندہ رہیں دوسرا جیئے یا مرے۔

اسبارہ میں جہانتک ہندوستان کا تعلق ہے ہمارے ناظرین اپنی موجودہ کیفیت کا خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہم ہندوستانی ملازمت کی سوکھی ہڈیوں پر کیسے جھپٹتے ہیں۔ کیا کوئی آنکھ رکھنے والا ہندوستانی کہہ سکتا ہے کہ برٹش گورنمنٹ کی گزشتہ شخصی حکومت کی قلم کے ایک چھوٹے سے جھٹکے نے جس میں اُس نے ہندوستان کو جداگانہ انتخاب کا تحفہ دیا تھا ہندوستان میں کیا آفت برپا نہ کر دی۔ جو اب برطانیہ کے بھی سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ ہندو اور مسلمان دونوں خلوص اور محبت سے رہتے تھے کوئی سوال ہی نہ تھا ہندو اور

مسلمان کا نہ تھا۔ میرے بزرگ اور عزیز ناظرین مجھکو آپ باور کریں کہ پچیس[۲۵]
سال پیشتر میں نے اور میرے محلہ والوں نے ایک مسلمان اُمیدوار کو نہ
صرف ہندو قوم بلکہ اپنے فرقہ کے معزز اور بڑی ہستیوں کے مقابلہ میں صرف
ووٹ ہی دیئے بلکہ اُن کے لئے جان توڑ کوشش کی صرف اس بنا پر کہ مسلمان
صاحب حالانکہ وہ پوزیشن میں کم تھے مگر اُن کے بارہ میں یہ یقین تھا کہ وہ
کام تو کرتے ہیں۔ اس جداگانہ انتخاب کا نتیجہ آج یہ ہے کہ نہ صرف مسلمان اور
ہندو ہی آپس میں برسر پیکار ہیں بلکہ مسلمانوں کے جملہ فرقوں اور ہندوؤں کے
جملہ فرقوں میں رقابت، نفسانیت اور جنگ کا بازار گرم ہے۔ یہ جداگانہ
انتخاب کا اجراء اسی پالیسی پر مبنی تھا کہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" حالانکہ اب
سمجھدار ہندو اور سمجھدار مسلمان اور عیسائی اور رہنمایان دنیز برطانیہ کافی پریشان
ہو چکے ہیں۔ اور سب ہی مخلوط انتخابات کی فکر میں ہیں۔

غرضیکہ ایک سرمایہ دار ملک باوجودیکہ اسکے پاس اسکے ملک کی
ضروریات سے کہیں زیادہ دولت ہے مگر وہ زیادہ ہوس کی وجہ سے اور کبھی
نہ سیر ہونے والی خودغرضی کا پیٹ بھرنے کے لئے ہمسایہ ملکوں پر قابض ہوتا ہے
کیا علم جو اُنھوں نے پڑھا ہے اُسکا نتیجہ یہی ہے کہ کمزوروں کا حق سلب کریں۔
اُنکو ایذا پہونچائیں اور دولت کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے اُن کے ساتھ
بدی کریں۔ قانون قدرت یہ ہے کہ اس افراط کو برابر کرنے کے لئے ملک اور
قومیں آپس میں لڑیں یعنی جبکہ خودغرضی دور نہ ہوگی جنگوں کا بھی سلسلہ نہ ٹوٹے گا۔
جسطرح کوئی انسان تہیہ کرلے کہ وہ اپنے دل کو خودغرضی سے پاک ہی کردیگا۔

تو گرتے پڑتے وہ کامیاب ہو ہی جاتا ہے۔ اسیطرح ایک سرمایہ دار انسان سرآنہ رکھتے ہوئے اور ایک سرمایہ دار یعنی فاتح ملک بھی اپنی خود غرضی کی پالیسی کو یعنی امپیریلزم کو اپنے طرز حکومت سے نکال سکتا ہے۔ جسکی موجودہ مثال ہمارے سامنے برطانیہ کی ہے۔ کہ وہ کہتی ہے کہ "ہندوستان میں سامراج مرچکا ہے" چاہے وہ پورے طور پر نہ بھی مرا ہو۔ تاہم اس نے آئینی قوانین کو جاری کرکے چاہے وہ کچھ بھی نہ ہوں اس جانب قدم ضرور اٹھا دیا ہے اور توقع ہے کہ گرتے گراتے اور بجھتے جلاتے۔ روٹھتے راضی اور لڑتے لڑاتے جنگ کے بعد ہندوستان کو اب آزادی مل ہی جائیگی جسکے آثار اسوقت نمایاں بھی ہو رہے ہیں۔ اور ہمکو یہ بھی یقین ہے کہ ادھر تو برطانیہ ہندوستان کو مکمل آزادی دیگی اور ادھر ہندوستان کو بھی جو خوف برطانیہ کی جانب سے ہے جاتا رہیگا۔ اور دونوں ہی ان پرانی باتوں کو جو انسانی فطرت اور وقت کے مقتضی تھیں بھول جائیں گے۔ اور آئندہ مل جل کر اور ایک سچے دوست کی طرح شیر و شکر ہو کر اور اپنے دلوں کو خود غرضی سے پاک کرکے ہندوستان کو جنت نشان بنائینگے۔ تاکہ آئندہ کل دنیا بھی بلکہ برطانیہ اور ہندوستان کی طرف آنکھ بھی نہ اٹھا سکے۔ بلکہ انکی تقلید کرے۔

شخصی خود غرضی ہی کا نتیجہ غلامی ہے

اب ایک اہم سوال ہمارے سامنے یہ آتا ہے کہ مشیت ایزدی یہ کیوں ہے کہ ایک ملک دوسرے ملک کا غلام بنایا جاتا ہے یا ہندوستان پر غلامی کا

سب سے بڑا قہر الٰہی کیوں ٹوٹا۔ اور وہ کیوں غلام بنایا گیا؟

مجھکو اسوقت اس زمانہ سلف سے بحث نہیں جو ویدک زمانہ
تھا۔ جو ست یگ۔ دواپر ترتیا۔ اور کلجگ کے بہت بڑے حصہ تک قائم
رہا۔ اور جس زمانہ میں ویدوں کے اس الہامی تلقین پر "کہ خدا ایک ہے
دو نہیں۔ تین نہیں۔ چار نہیں۔ پانچ نہیں۔ چھ نہیں، سات نہیں، آٹھ نہیں،
نو نہیں" ہندوستان کے لوگ بھی مذہبی سختی سے قائم رہے۔ اور جس زمانہ
کو لوگوں نے دھرم راجیہ یا رام راجیہ کے ناموں سے یاد کیا ہے۔ اور جن
چاروں جگوں کی ابتک کی عمر ایک ارب چھیانوے کروڑ اور کئی لاکھ سال
کی بتلائی گئی ہے اور جو اسوقت زیر تحقیقات ہے۔ حالانکہ مغربی محققین نے
دنیا کی عمر کئی کروڑ سال کی ہونا تسلیم کرلی ہے۔ اور جس زمانہ کی اپنی حد کو پہونچی
ہوئی سائنس، فلسفہ، علم، تہذیب، بلند خیالی، وسیع النظری۔ طرز و
طریق، حق پسندی، حق شناسی، سچائی اور راستبازی کی جھلک مہابھارت
اور رامائن وغیرہ کتابوں سے تھوڑی بہت ملتی ہے۔ اور جن دونوں کتابوں
کے ذریعہ بھگوان کرشن اور بھگوان رام نے نہ صرف علم الٰہی بلکہ
جملہ مشکل۔ سیاسی وغیرہ مسائل پر ہندوستان اور دنیا دونوں کی لازوال
اور لاثانی رہنمائی کی ہے۔ میں اسوقت اُن ایام کا تذکرہ کرتا ہوں جو اب سے
صرف دو ہزار برس کے کچھ ادھر کا زمانہ ہے اور جس بارہ میں اسکولوں
کی مروجہ تاریخوں میں بھی تحریر ہے۔ اور پھر جسکو غیر ملکی سیاحوں نے بھی اپنی آنکھوں
دیکھا تھا اور باقاعدہ تحریر کیا ہے کہ اسوقت تک ہندوستان کے لوگ اچھے

چال چلن کے نیک اور دھرماتما تھے۔ خدا پرست اور خدا ترس تھے۔ ہمیشہ سچ
ہی بولتے تھے۔ ایک دوسرے کا اعتقاد تھا۔ مقدمہ بازی کا نام و نشان نہ تھا۔ چوروں
اور لٹیروں کا خوف نہ تھا۔ گھروں میں تالے نہیں لگائے جاتے تھے۔ بلکہ مجھکو بتلایا
گیا ہے کہ سنسکرت لغت میں تالے کے لئے کوئی لفظ بھی نہیں ہے۔ ہر شخص کو
مذہبی اور سوشل اور نجی آزادی میسر تھی۔ مردوں اور عورتوں کے چال چلن کی دیکھ
بھال کے لئے اور یہ بھی پتہ لگانے کے لئے کہ لوگ اپنے ماں باپ سے نیک برتاؤ کرتے
ہیں یا نہیں اور اپنے فرائض منصبی کو اُن کے ساتھ پورا پورا ادا کرتے ہیں یا نہیں
الگ الگ افسران مقرر تھے۔ چاروں طرف چین رہتا تھا۔ دولت کے ذرائع
لامحدود تھے۔ لوگ خوشحال تھے، خوش تھے اور فارغ البال تھے۔ جانوروں
تک کے لئے اسپتال تھے۔ جانوروں پر بھی سختی نہیں ہونے پاتی تھی۔ ملک کے
لئے ہر شہر اور قصبہ وغیرہ میں ہسپتال تھے، نہ صرف دوا اور علاج معالجہ
بلکہ کھانا اور لٹریچر تک بلا معاوضہ گورنمنٹ کی طرف سے دیئے جاتے تھے
راجہ اپنی پرجا کے سکھ میں اپنا سکھ اور پرجا کے دکھ میں اپنا دکھ سمجھتا تھا۔ اور
پرجا کو اپنا پتر یعنی بیٹا سمجھتا تھا۔ عورتوں کا کما حقہٗ احترام اور رتبہ تھا۔ پردہ
بالکل نہ تھا۔ عورتوں میں تعلیم عام تھی۔ ایسی بھی متعدد علوم و فنون میں بڑی بڑی
عالم و فاضل گزری ہیں۔ ہندوستان میں اس وقت متعدد دارالعلوم تھے۔
جن سے جملہ اقسام کے علوم و فنون و تہذیب تمدن کی نہ معلوم کتنی گنگائیں
اور جمنائیں نہ صرف ہندوستان بھر میں بہتی تھیں بلکہ جن سے ایشیا اور دور
دور کے ممالک تک فیضیاب ہوتے تھے۔ ٹیکسیلا اور نالندہ کی یونیورسٹیاں

میں تو دس دس ہزار طلبا ایک ساتھ تعلیم پاتے تھے۔ جنکے تعلیم قیام اور طعام کا وہیں پر بجانب گورنمنٹ انتظام تھا۔ ان دارالعلوموں میں چین۔ تبت وسط ایشیا، بخارا، اور کوریہ اور تمام ایشیا سے طلبا تحصیل علوم کے لئے جوق جوق آتے تھے۔ ہندوستان میں غیر تعلیم یافتہ کوئی نہ تھا۔ تاریخی تذکرہ ہے کہ راجہ وکرمادت سنسکرت میں کوئی اشلوک پڑھتا جا رہا تھا۔ کیا دیکھتا ہے کہ ایک لکڑہارے نے اپنے سر کا بوجھ ایک چبوترے پر رکھ دیا۔ راجہ نے پوچھا کیا تم بوجھ سے تھک گئے ہو۔ لکڑہارے نے جواب دیا کہ میں لکڑیوں کے بوجھ سے تو نہیں تھک گیا ہوں مگر آپ نے اشلوک کے پڑھنے میں فلاں لفظ کا تلفظ غلط کیا ہے اُس سے میرا دل ضرور بیٹھ گیا ہے۔ دنیا کے جملہ ممالک سے ہندوستان اپنے جہازوں کے ذریعہ تجارت بھی بڑے اعلیٰ پیمانہ پر کیا کرتا تھا۔ ہندوستان کے لوگ روم اور امریکہ تک میں جاکر بسے تھے۔ اور جسکے بارہ میں "ہند و امریکہ" وغیرہ کتابوں میں مستند تحقیقات بھی کیگئی ہے۔ اس زمانہ میں ہندوستان میں ذات اپنے اپنے کرم یعنی اعمال اور اپنے اپنے عقیدہ، رجحان اور پیشہ پر منحصر تھی آپس میں روٹی اور بیٹی کا چھوت چھات نہ تھا۔ کھان اور پان میں کوئی بھید نہ تھا۔ غیر ممالک سے اس بڑے پیمانہ پر تجارت کا ہونا اور آمد و رفت کا ہونا اور طلباء کا تحصیل علم کے لیے غیر ممالک سے آنا اور ایک ساتھ رہنا سہنا بھی اس امر کی اٹل شہادتیں ہیں۔ کہ دوسرے ملکوں سے بھی کھان پان کا کوئی اختلاف نہ تھا گویا اُس وقت لوگ توحید کے قائل تھے۔ اور خدائے پاک کی ملکی اور غیر ملکی

دونوں دلاوروں کو اپنا بھائی سمجھتے تھے اور ویسا برتاؤ بھی کیا کرتے تھے۔ مگر
کروڑوں برسوں کے الٹ پھیر کے بعد ویدک مذہب میں رفتہ رفتہ اسوقت
تک ہزاروں شاخیں ہوگئیں تھیں اور جسکی وجہ سے ویدک زمانہ اور ویدک
مذہب اور ویدک تہذیب تینوں پر زوال آیا۔ اور آخر میں خاصکر بگڑے ہوئے
ویدک اور بودھ مذہب کے درمیان ہولناک تصادم کی وجہ سے ہندوستان
کی متحدہ سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ نہ صرف متعدد حکمرانوں میں
آپس میں بلکہ ہر ایک چھوٹی اور بڑی حکومت کے حکمرانوں اور پروہتوں یعنی
پجاریوں میں مذہبی اور سوشل اور خاصکر ذاتی اقتدار کی رقابت اور اپنی اپنی
برتری اور فضیلت کو دکھلانے اور قائم رکھنے کی غرض سے خودی، خودغرضی
اور انانیت کا بازار اسقدر زیادہ گرم ہوا کہ وہ ایک غیر معمولی حد کو پہنچ گیا۔ اور
چھوٹی اور بڑی حکومتیں کمزور اور مغلوب ہوگئیں۔ اور جسطرح بڑے سے بڑے اور
پاک سے پاک دریا کا پانی اکثر کٹ کر داہنے اور بائیں جانب چھوٹے چھوٹے نالوں
اور تنگ گڑھوں میں گیا پڑ جاتا ہے اور کچھ دنوں بعد اسمیں کیڑے پڑ جاتے ہیں
اور تعفن آنے لگتا ہے اسیطرح پانچسو سال کے اندر اندر اس زمانہ کے
ہندو خودی، خودغرضی اور انانیت میں اسقدر زیادہ ڈوبے کہ معرفت خدائی
کو بھول گئے اور باطل پرستی، توہم پرستی اور مردم پرستی میں پڑ گئے۔ بلکہ آپس میں
رقابت۔ نفسانفسی۔ عناد اور دشمنی اور مذہبی تعصب کے جذبات مستقل
طور پر ہر ایک ہندو میں سرایت کر گئے اور اسکے جزو بدن ہو گئے۔ اور برتری
اور پاکیزگی کا یہ معیار بنگیا کہ کون کس سے زیادہ پرہیز کر سکتا ہے

الگ تھلگ رہ سکتا ہے۔ اور ایک دوسرے کو چھو تک نہیں۔ ایک دوسرے
کے ہاتھ کا چھوا ہوا کھانے پینے ہی میں نہیں بلکہ چلنے پھرنے اور رہن سہن
میں بھی نہایت سخت اور بڑھتے بڑھتے پرہیز کرتا ہے۔ اور نوبت یہاں تک
پہونچی کہ گھر میں یعنی بیٹوں اور بھائیوں اور بہنوں اور بیویوں تک میں تھالی
الگ الگ اور ایک خاندان کے افراد میں چوکا الگ الگ اور پھر غیر ملکی
بھائیوں کے ساتھ اور غیر ممالک کے سفر کے سلسلہ میں جو کھانے پینے وغیرہ
میں چھوا چھوت کا برتاؤ مذہب کے نام پر جائز رکھا گیا اور برتا گیا ہے اور
جو ہندو مذہب کا معیار بن گیا وہ ظاہر ہے کہ اگر کسی ہندو نے کسی غیر ہندو
کے ہاتھ کا پانی تک پی لیا یا غیر ملکوں میں بغرض حصول تعلیم و سیاحی چلا گیا تو
وہ ہندو قوم اور ہندو مذہب کے دائرہ ہی سے گویا باہر ہو گیا۔ اور جس کا
زہر کا رچی ابھی تک ہندوؤں میں عام طور پر بڑی سختی کے ساتھ سرایت
کئے ہوئے ہے۔

عرصہ تیس ۳۰ سال کا ہوا کہ میرے ایک ٹھاکر دوست بی۔ اے
ایل ایل۔ بی اعظم گڈھ کے رہنے والے مع اپنے لڑکے کے لکھنؤ میں میرے
یہاں مہمان تھے۔ چونکہ اپنے گھر سے تقریباً دو سو میل کے فاصلہ پر تھے
اور موجودہ تعلیم اور نئی روشنی کا بھی کچھ اثر لئے ہوئے تھے اور وہ روٹی
کھانے پر تو معترض نہ ہوئے مگر جب دو تھالیاں آئیں ایک میرے لئے اور
ایک ان کے اور ان کے لڑکے دونوں کے لئے تو فرمایا کہ دو ہی تھالیاں کیوں؟
میں تو جلدی میں یہ سمجھا تھا کہ انکا منشا یہ ہے کہ ہم سب ایک ہی تھالی میں

میں کھاتیں۔ مگر انھوں نے میرے اس سہو کو فوراً ہی درست کیا اور کہا کہ
تین تھالیاں ہونی چاہئیں، کیا میرا لڑکا نہ کھائیگا؟ مجھکو سناٹا ہو گیا اور میں
دم بخود رہ گیا۔ جس قوم اور جس ملک کے اندر اتنی زیادہ اور پھر انگریزی پڑھے
لکھے لوگوں میں تنگ نظری اور تنگدلی اس غایت درجہ کو پہونچی ہو اور جو اسکے
مذہب کا معیار بن گیا ہو تو اسمیں گڑھوں کے پانی کی طرح کیڑوں کا پڑ جانا اور
تعفن آنا ایک فعل قدرت ہے۔

خانہ جنگیوں اور باطل پرستیوں کی یہی حالت بلکہ اس سے زیادہ بدتر حالت
ایشیا اور دوسرے ممالک میں بھی تھی۔ جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بعدہٗ حضرت
محمد صاحب صلی اللہ علیہ وسلم کا یکے بعد دیگرے ایشیا کے مشرقی حصہ میں
ورود ہوا۔ آنحضرت محمد صاحب نے اُن سخت اور گھنے اور کالے بادلوں کو جو
توحید کے چاروں طرف اس شدت کے ساتھ اُمنڈ رہے تھے یکلخت ہٹا اور
مٹا دیا اور توحید کا آفتاب عالمتاب اپنی پوری دمک اور چمک کے ساتھ پھر روشن
ہوا۔ اور جسکی خوشگوار روشنی نے تقریباً تمام دنیا کو روشن کیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ
آنحضرت نے مساوات کے آبحیات کی وہ قدرتی گنگا خلق اللہ کو پلائی
جسکی تمثیل دنیا میں کسی اور جگہ ملتی ہی نہیں۔ آج کے دن تک بھی اگر کوئی مسلم
چاہے مفلس ہو۔ اور چمار ہی اور دھوبی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہوا اور چاہے بھنگن
ہی کیوں نہ ہو اگر وہ مسجد میں سب سے اول داخل ہوا ہے اور اس نے نماز پڑھنا
شروع کر دیا ہے تو اسکے بعد اگر مسلم بادشاہ وقت بھی آئیگا تو اپنی آخری صف
میں اسکے پیچھے ہی کھڑا ہو کر نماز ادا کریگا۔ امیر سے امیر اور علما سے علما تک

بسترخوان پر اسی طریقہ پر اُس مفلس کا دلی اور پُرجوش استقبال ہوگا چاہے وہ
بھولا بھٹکا ہی کیوں نہ آگیا ہو، جیسے اپنے ایک عزیز اور اقارب کا ہوگا۔ نہ صرف
آنحضرتؐ نے ہی بلکہ اُنکے پیروؤں نے بھی جو بادشاہ وقت تھے اپنی مسلم
رعیت اور اپنے چھوٹے سے چھوٹے نوکروں کے ساتھ ایسی لاثانی ہمسری، برابری
اور مساوات اور انصاف اور بھائی چارہ کا سلوک ہمیشہ ہی کیا جو وہ خود کے ساتھ
اور اپنے بچوں اور رشتہ داروں کے ساتھ روا رکھتے تھے تبھی سے آنحضرتؐ
نے دوسرے مذہبوں اور اُن کے پیشواؤں کی توقیر کی ہمیشہ ہی عملی تلقین کی۔ جن
سب کے سنہری تذکروں سے تاریخ لبریز ہے۔ اور یہی باتیں الخاصکر مساوات کا
عامل ور اکیلا راز مسلمانوں کی دنیا کے کثیر حصّہ پر دنیز ہندوستان پر اقتدار اور
سلطنت کا ہوا۔

تذکرہ ہے کہ ایک راجکمار بابر بادشاہ سے اپنے باپ کے جنگ میں قتل کا بدلہ
لینے کے لئے ایوان شاہی کے اِدھر اُدھر گھات میں تھا۔ دیکھتا کیا ہے کہ سامنے
سے ایک قوی اور مست ہاتھی دوڑا چلا آرہا ہے۔ راجکمار کے پاس ہی ایک
دودھ پیتا بچہ بھی اُس بھاگتی ہوئی بھنگن کی گود سے گر پڑا ہے جو ابھی جھاڑو
دے رہی تھی۔ آتے ہوئے پاگل ہاتھی اور اُس بچے میں کچھ گز کا فاصلہ ہوگا۔ راجکمار
نے چاہا کہ میں اُس بچّہ کو اُٹھا لوں جس کے لئے بھنگن چلا کر داد و فریاد کر رہی تھی۔
مگر راجکمار کو فوراً ہی تامل یہ ہوا کہ میں ایک بھنگن کے بچّہ کو کیونکر چھوؤں۔ اور
یہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ دیکھتا کیا ہے کہ ایک دلاور ایوان شاہی سے بھاگتا
ہوا اُترا اور دوڑ کر اُس نے اپنے ٹھیک نشانہ سے بھرپور گرز ہاتھی کے

ماتھے پر مارا کہ ہاتھی چلاتا ہوا پیچھے کو بھاگا۔ اور وہ دلاور اُس بھنگن کے بچّہ کو
گود میں لیکر محل کو واپس ہو گیا۔ راجکمار ہکّا بکّا رہ گیا۔ اور جب اُسکو یہ معلوم ہوا
کہ وہ دلاور شخص قابل، عادل اور عالم بادشاہ ظہیر بابر بدولت تھے تو ایک تو
اپنی اخلاقی کمزوری اور بزدلی کی خجالت سے پانی پانی ہو گیا اور دوسرے بادشاہ
ہندوستان کی اپنی رعیت اور پھر ایک بھنگی رعیت کے بچّہ کی جان بچانے کیلئے
اپنی جان جوکھم میں بلا پس و پیش بلکہ از خود اور فوراً ہی ڈالدینے کے خیال نے
اسکو دریائے حیرت اور عبرت میں ڈالدیا۔ یہ راجکمار شاہی حضور میں حاضر ہوا
اور اپنی تلوار شہنشاہ کے حضور میں پیش کرتے ہوا استدعا کی کہ میرے اس پاداش
میں کہ میں آپکی ایسی قیمتی اور بے بہا جان کے لینے کے پھیر میں تھا آپ مجھکو میری
ہی تلوار سے قتل کر دیں۔ مگر بابر ہنسا۔ اُسنے راجکمار کو پدرانہ شفقت سے
تسلّی دی اور ساتھ ہی ساتھ اُسکے راج کی واپسی کا حکم صادر فرمایا۔ یہ ہیں وہ
وجوہ جنکی وجہ سے ہندوؤں کے ہاتھوں سے ہندوستان کی حکومت کو لیکر
خداوند عالم نے مسلمانوں کے سپرد کی۔

جب یورپ اور ایشیا و نیز ہندوستان بھر میں تابڑ توڑ فتوحات اور ملکوں کے
ملنے اور اپنی عظیم سلطنت اور اسکے دبدبہ کی وجہ سے اُسوقت کے مسلمان بادشاہوں
اور حکاموں کے دلوں میں تکبّر خودی اور انانیت کا نشہ اپنی حد کو پہنچا اور مساوات
اور توحید کی تبلیغ کرنے کی جگہ حکومت اور سیاست اور جاہ و حشمت کی بو انکے
دماغوں میں بسی اور جس وجہ سے اُنکے ہر ایک رویہ اور ہر ایک حرکت میں خودی
خودغرضی اور انانیت کا پورا پورا تسلط ہو گیا تو اُنہوں نے نہ صرف اپنے باپ اور

اپنے ہی بھائیوں اور بیٹوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے بلکہ اسلامی تبلیغ و تبدیلِ مذہب کو ایک سیاسی آلہ کار بنایا کہ باشندگانِ ہندوستان میں دو برابر کی صفیں بنا دو اور حکومت کرو۔ اور پھر اپنی رعیت کے ساتھ جملہ اقسام کے جبر اور تشدد کو بھی روا رکھا۔ اور جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف اپنی حکومت ہی سے اُن کو ہاتھ دھونا پڑا بلکہ رفتہ رفتہ شجاعت اور حمیت دونوں نے اسلامی دنیا سے منہ موڑا۔

یورپ میں عیسائی لوگ جب مسلمانی فتوحات و نیز اُن کے مظالم اور تعدی سے گھبرا اُٹھے تو انھیں اپنا خدا یاد آیا۔ اور مسلمانوں کی کاٹ کے لیے حضرت عیسیٰ ؑ کے احکامات کی تلقین کی اور اُن پر عمل بھی شروع کیا اور سچائی، انکساری، خدمت اور محبت کے ذریعہ لوگوں کے دلوں کی عملی تسخیر شروع کر دی۔ کہ جو کوئی تمہارے داہنے گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا بھی اُسکی طرف پھیر دو۔ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔ اپنے ستانے والوں کے لئے دعا کرو۔ نیکی سے بُرائی کو مغلوب کرو۔ کیونکہ جو تلوار کھینچتے ہیں وہ تلوار سے ہلاک کئے جائینگے۔ اور یہ بھی تلقین کی کہ "ابنِ آدم اسلئے نہیں آیا تھا کہ خدمت لے بلکہ اسلئے کہ خدمت کرے۔ اور وہ نرمی اور انکساری کے لئے بھیجا گیا تھا تا کہ دنیا کو محبت کے ذریعہ نجات دے نہ کہ تشدد سے۔ اور یہ بھی کہ جب تک گیہوں کا دانہ زمین میں گر کے مر نہیں جاتا اکیلا رہتا ہے لیکن جب وہ مر جاتا ہے تو بہت سے پھل لاتا ہے۔ یعنی جو اپنی جان کو عزیز رکھتا ہے وہ اُسے کھو دیتا ہے اور جو دنیا میں اپنی جان سے عداوت رکھتا ہے وہ اُسکو ہمیشہ کی زندگی کیلئے محفوظ رکھتا ہے۔ و نیز کہ ابنِ آدم اسلئے آیا کہ اپنی جان بہتیروں کے لئے فدیہ میں دیدے۔ بالفاظ

دیگر میری رائے میں بھی اُسی کو دوامی زندگی حاصل ہے جو دوسروں کیلیے
مرا ہے۔ یعنی جس نے نہ صرف خودی کو بلکہ خود کو بھی دوسروں کے لئے مٹا دیا۔
اور بلا شک یہی انسان کی ماہیت اور یہی انسان کا جوہر ہے۔ اور اسی تعلیم
سے میں اس اٹل اصول پر آتا ہوں کہ اپنی قوم اور اپنے ملک اور اپنے مذہب کا فروغ
قیام اور استحکام اور اقتدار اور وقار کسی کی جان لینے سے نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اپنی
ہی جان خوشی خوشی دینے سے ہی ممکن ہو سکتے ہیں۔

بالآخر نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیت کا غلبہ اور اقتدار اور عیسائی حکومت دونوں
نہ صرف یورپ اور امریکہ بلکہ ایشیا اور ہندوستان میں پھیلی اور تقریباً تمام دنیا میں
پھیلیں اور بادی النظر میں ایک لازوال طریقہ پر قائم ہوئیں۔

ہندوستان میں آج کے دن بھی ہم دیکھتے ہیں کہ اُس حکمران قوم کی اعلیٰ
سے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معزز خواتین جنکے حکام ہم ہندوستانیوں کی خودی کو تاہ نظری
پھوٹ اور قومی اور ملکی خودداری کے مفقود ہونے اور قومی اور ملکی غداری ہونے
کے باعث اپنے پالتو جانوروں کے مقابلہ میں بھی بسا اوقات کوئی وقعت نہیں رکھتے
اور غالباً اکثر ہماری زندگی کی گاجر اور مولی سے زیادہ قیمت نہیں لگاتے۔ انکی
ہندوستانی بیمار بچوں کی اپنے ہسپتالوں میں اپنے ہی ہاتھوں تیمارداری کرتی ہیں انکو
نہلاتی ہیں اور کپڑے پہناتی ہیں اور انکی قے تک اپنے ہی ہاتھوں میں اکثر لیتی ہیں
اور پھر انکو تعلیم و تربیت اور تہذیب کے زیوروں سے آراستہ اور پیراستہ کر کے انسان بناتی
ہیں جنکو ہم ہندوستانیوں کے پرچھی سے بھی آریہ سماجی - تلک دھاریوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔
۲۹ اور بڑے بڑے سیاسی رہبر اور بڑے بڑے عالم پنڈت اور مولوی جو اپنے اپنے

مگر جو بیسیوں ایک اور خونریزیاں جنگیں ملکوں میں ہوئیں آج بھی جن مذہبی فسادوں
خصومت اور مار دھاڑ کا بازار گرم ہے تو اسکی بھی وجہ صرف یہی ہے کہ ہم
اور ہمارا مذہب" یعنی انانیت کے نشہ میں لوگ ازخود رفتہ ہو گئے اور
ہو جاتے ہیں جس سے رقابت پیدا ہوتی ہے ۔ رقابت سے تعصب اور
تعصب سے دشمنی اور دشمنی کا نتیجہ جنگ ہوا اور ہوتا ہے ۔ اور بالآخر ایک
ملک کو دوسرے کا غلام ہونا پڑا ۔

اسی طریق پر ہر ایک مذہب کے بہت سے فرقوں میں آپس کی دشمنی کی وجہ
خودی اور خود غرضی ہی ہے تینوں مذہبوں میں اور خاصکر ہندوؤں میں سیکڑوں
ہی مذہبی فرقے اسوقت موجود ہیں ۔ اور دن بدن اور ہوتے جاتے ہیں ۔
ٹھیک جیسے اگر ایک ہی شکل اور قدوقامت کے کھلونوں کو ہم نے مختلف رنگوں
میں رنگ دیں اور پھر ان کھلونوں کے ہر ایک عضو کو بھی باری باری ایک ایک کرکے
مختلف رنگوں میں رنگتے چلے جائیں تو بادی النظر میں ایک دوسرے سے مختلف
کھلونے ان گنتی بن سکتے ہیں اور جن کے نام بھی الگ الگ رکھے جا سکتے ہیں
حالانکہ یہ سب کھلونے ایک ہی شکل ایک ہی مٹی اور ایک ہی قدوقامت
کے ہیں یعنی ایک ہی ہیں ۔ اسی طرح ان تینوں مذہبوں میں اور خاصکر ہندوؤں
میں بے شمار مذہبی فرقے پیدا ہو گئے اور پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ مگر جنکے
بنیادی اصولوں کے بارے میں اپنے اپنے شرح سے کوئی اختلاف قطعی
نہیں ہے ۔ مگر رفتہ رفتہ انہیں بھی آپسمیں دشمنی اور خونریزیاں ہوئیں اور
ہوتی رہیں ۔ اسکی خاص وجہ میری تحقیقات اور غور کے مطابق یہی ہے

کہ ان ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں برسوں کے اندر مختلف اوقات پر ہر ایک
مذہب کی اپنی دوران زندگی میں اُسکے پیشواؤں، رہنماؤں اور پیروں نے
ارادتاً یا سہواً اگر عام طور پر خود ہی اپنے ناموں سے یا انکی پیروی کرنیوالوں نے انکے ناموں سے
یا انکے مقرر کیے ہوئے ناموں سے نئے نئے مذہبی عقیدوں اور تحریکوں یا وقتی ضرورتوں اور خیالات کی اور
ان خیالات کے لوگوں کی انجمنوں کو نامزد کیا اور کرتے ہیں تاکہ ان پیشواؤں کی
شہرت ہو اور انکا نام ہمیشہ قائم اور دائم رہے۔ اسلئے اسی خودی اور خود غرضی
کے باعث ان مختلف فرقوں میں قدرتی طور پر آپسمیں یا تو اسی وقت سے یا بعد کو
رفتہ رفتہ بھید بھاؤ شروع ہوا۔ بھید بھاؤ سے اجتناب، اجتناب سے
رقابت، رقابت سے تعصب اور تعصب سے دشمنی اور جس دشمنی نے سوشل عدم تعاون
کی بھی صورت اختیار کی اور جو آخر کار سیاسی دشمنی میں مبدل ہوگئی۔ اور آپسمیں خونریزیاں
زور اور شرارت کے ساتھ ہوئیں۔ اور نوبت یہاں تک پہونچی کہ اپنے ہی مذہب
کے فرقے کو نیچا دکھانے اور زیر کرنے کے لئے دوسرے مذاہب والوں اور
اکثر دوسرے ملکوں تک کا سہارا لیا اور بالآخر نہ صرف وہ فرقہ بلکہ کل ملک ہی
دوسروں کا غلام ہوا۔ اور آپسمیں نفاق کی نہ کوئی حد رہی اور نہ حساب۔
اسلئے اسمیں کوئی شک ہی نہیں کہ ہماری سرمایہ داری یعنی ہماری خود غرضی ہی ہماری
غلامی کی وجہ تھی اور جسکی پوری پوری ذمہ داری ہمارے اوپر ہی عاید ہوتی ہے نہ کہ
دوسروں پر۔ اب سوال یہ آتا ہے کہ ہماری سرمایہ داری یعنی ہماری خود غرضیاں
کیا ہیں۔ ہندوستان میں بھی ثروت اور دولت والے دو قسم کے ہیں:۔
(۱) ایک تو وہ ہیں جو سرمایہ رکھتے ہیں اور سرمایہ دار یعنی سامراج بادی

کبھی یعنی خود غرض ہیں۔ اور

(۴) دوسرے جو سرمایہ رکھتے ہیں مگر سرمایہ دار یعنی سامراج بادی یعنی خود غرض نہیں ہیں۔

جو سرمایہ رکھتے ہیں اور سرمایہ دار یعنی خود غرض بھی ہیں

جس وقت تک ہندوستان کے مہاراجوں اور بادشاہوں نے اپنی رعیت کو اپنا بیٹا اور اسکے سرمایہ داروں نے بھی اپنے ہم وطنوں کو اپنا بھائی سمجھا اور دونوں ہی نے حق اور ناحق۔ نیکی اور بدی۔ سکھ اور دکھ کی تمیز کی اور علم نیکیاں کو صحیح معنوں میں سمجھا اور اسکو برتا اس وقت تک ہندوستان نے دنیا کو جملہ علوم و فنون۔ فلسفہ۔ سائینس۔ ہندسہ۔ تہذیب اور تمدن اور روحانیت کی مشعل دکھلائی اور ہندوستان ہی تمام دنیا کو ہیرے جواہرات اور کپڑے وغیرہ سب ہی کچھ مہیا کرتا رہا۔ اور اسکی تجارت ایشیا اور یورپ دونوں میں پھیلی اور چیزوں کی وجہ سے ہندوستان کو جنت نشان کے نام سے پکارا گیا۔ مگر جب اسکے بادشاہوں، راجوں اور سرمایہ داروں نے خود غرضی پکڑ کر بدی اور حق اور ناحق کی تمیز نہ کی اور اپنے سرمایہ کے رخ کو عیش و عشرت کی طرف کر دیا۔ اور نفس پرستی انکا شیوہ اور معیار زندگی بن گیا اور ملک کا روپیہ اور اپنا وقت دونوں کھیل کود۔ تماشہ۔ ناچ رنگ۔ نشہ بازی اور قمار بازی اور ایسی ہی واہیات باتوں میں کھونے لگے۔ تو آپس کی رواداری اور محبت کی جگہ نفرت اور نا اتفاقی۔ جھوٹ اور بدچلنی اور بداعمنی نے لے لی۔ اور نتیجہ بالآخر

یہ ہوا کہ ہندوستان کے بادشاہ - راجے اور اُنکے نجا اور اُنکے نشیں اور اُسکے امیر اور غریب سب ہی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے گئے -

ہم ہندوستانیوں کی گذشتہ سرمایہ داری بھی خودغرضی کی تھی جسکے نتیجے اپنی آنکھوں کے سامنے ہیں

ہندوؤں و نیز مسلمانوں کے ہندوستان میں عہد حکومت کے آخر زمانہ میں جب دونوں پر یکے بعد دیگرے زوال آیا اُسوقت ہندوستان کی سرمایہ داری کیا تھی ہمارا عیش و عشرت کیا تھا اور ہماری خود غرضی کیا تھی اور کس حد تک پہونچی تھی یہ ایک لمبی کہانی ہے جسکی سزا ہماری موجودہ غلامی اور دنیا بھر کے مظالم اور مصیبتوں وغیرہ کی شکل میں ہمکو مل رہی ہے اور جسکی حقیقت میں پوری پوری ذمہ داری ہندوستان کے امیر و غریب دونوں ہی کی گردن پر ہے - نہ تو موجودہ گورنمنٹ اسکی ذمہ دار ہے اور نہ آئندہ آنیوالا کوئی اسکا ذمہ دار ہوگا - ہندوستان کے جابر صاحب اسوقت تک ہرگز نہ ملیں گے جبتک کہ ہندوستان کے غریب اور خاصکر امیر دونوں ہی اپنے دلوں سے خود غرضیوں کو بالکل نکال نہ دینگے - اسبات کا تھوڑا سا ذکر کہ ہماری سرمایہ داری کیا تھی اور کیا ہے میں صرف اسوجہ سے کرتا ہوں کہ آئندہ کیلئے تو ہماری آنکھیں کھلیں - چنانچہ اسکا تھوڑا بہت اندازہ لگانیکے لئے ضروری ہے کہ ہم غور کریں کہ اس موجودہ غلامی میں جسکا اثر امیر اور غریب دونوں پر یکساں ہے ہم ہندوستانیوں میں کتنی خانہ جنگیاں ہیں ؛

جملہ فرقوں میں آپس میں کتنی عداوت ہے۔ اور ہم آپس میں خونخوار جانوروں کی طرح کیسے لڑتے ہیں۔ اور امیر و غریب اور چھوٹے اور بڑے اور چھوٹی اور بڑی ذات کا کسقدر امتیاز ہے۔ اور ابھی تک ہم یہ نہیں سمجھتے کہ آدمی کو شرف علم اور عقل سے ہے۔ علاوہ ازیں ہم کو خواہ اپنی یا کسی دوسرے ملک کی بھی خانہ جنگیوں وغیرہ کا اندازہ لگانا منظور ہو تو وہ اسی طرح پر ہو سکتا ہے اگر ہم یہ معلوم کریں کہ اسکے سول اور فوجداری کی کچہریوں اور ہائیکورٹوں اور وکلاء کی فیسوں اور جھگڑے وغیرہ میں کسقدر روپیہ صرف ہوتا ہے۔ علاوہ اسکے ہندوستان میں آپ یہ بھی دیکھیں اور شمار کریں کہ کتنے لوگوں کو ایک وقت کا کھانا مشکل سے ملتا ہے۔ کتنے لوگ بھوکے سو جاتے ہیں۔ اور کتنے فاقوں سے مر جاتے ہیں کتنے لوگوں کے تن پر کپڑا تک نہیں ہے۔ ایک گھر کے کتنے لوگ خاصکر دیہات میں سب مل جل کر ایک ہی پھٹے پرانے کمبل میں برسوں جاڑے بتا دیتے ہیں۔ کتنے لوگ آگ تاپ کر جاڑے کی راتیں گزارتے ہیں۔ کتنے لوگ گڈھے کھود کر اور انمیں پیال بچھا کر گویا جانوروں کی طرح ماند بنا کر جاڑے کاٹتے ہیں۔ کتنے لوگ بھیک مانگکر اپنا پیٹ بھرنے کے لئے مجبور ہیں۔ وباؤں کے وقت میں عام طور پر بھی کتنے لوگ بے کفن گاڑے اور جلائے جاتے ہیں۔ اور کتنے مرنے والوں کو انکے ورثا کفن بھی اپنے داموں نہیں دے سکتے ہیں۔ کتنے اپاہج اور کتنے کوڑھی اور کتنے یتیم اور فقیر در بدر مارے پھرتے ہیں اور انمیں سے کتنے سڑکوں پر ہی پڑے رہنے اور بے نام و نشان مر جانے کے لئے مجبور ہیں۔ اور پھر اوسط درجے کے کتنے بیشمار لوگ اور کتنے بیشمار

لڑکے بے روزگار ہیں۔ اور کتنے لہلہاتے ہوئے غنچوں نے بے روزگاری سے
تنگ آ کر خودکشی کر لی ہے۔ کتنے گھر دانہ دانہ کو محتاج ہیں۔ کتنے گھروں میں فاقوں
سے بلبلاتے ہوئے اور کھانے پینے کی چیزوں سے بھی ترستے ہوئے بچے بھوکے
سو جایا کرتے ہیں۔ کتنے گھروں میں بیماریوں اور مصیبتوں کا کہرام مچا ہوا ہے۔
کتنے لوگوں کو سستی سے سستی دوا بھی میسر ہونا ممکن ہی نہیں ہے۔ اور کتنے
لوگ عام طور پر اور خاصکر وباؤں کے ایام میں بدون علاج اور معالجہ مر جاتے
ہیں۔ اور دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ہماری اور خاصکر ہماری عورتوں اور
بچوں کی عمر کا اوسط کیا ہے۔ ہمارے ملک میں کتنے ہسپتال ہیں اور کتنے پاگل خانے
اور کتنے یتیم خانے جو ہماری سرمایہ داری اور نفسا نفسی کی وجہ سے بھرے
پڑے ہیں۔ اور اوروں کی ضرورت دن بہ دن بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور
پھر ہندوستان میں عصمت کی ان دنوں کیا قیمت ہے اور کیا وقعت ہے۔ یہ وہ
بھیانک واقعات ہیں جن کے دیکھنے یا سننے یا تحریر میں لانے سے روح
کانپ جاتی ہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا اور قلم میں لرزہ آتا ہے۔
اور قلم رک جاتا ہے۔ یہ ہیں نتیجے اور یہ ہیں پھل اس خودغرضی کے جسکے
بیج کو ہم نے اپنے دلوں میں بویا تھا۔ اور جن کے پھلوں کو ہم ہی خود کو کھانا
پڑتا ہے۔ مگر ہندوستان کے بہتیرے سرمایہ داروں کو انکی خودغرضی اور
جہالت نے اتنا زیادہ اندھا کر دیا ہے کہ انکو کچھ دکھائی نہیں دیتا اور نہ کچھ
احساس ہی ہوتا ہے۔ انکی خودغرضی نے انکے دل اتنے سیاہ اور سخت
کر دیئے ہیں کہ نہ تو ان کے دل پسیجتے ہیں اور نہ انکے سر [illegible]

بھی رنگینی ہے۔ کیا کوئی بھی گورنمنٹ چاہے وہ کتنی ہی طاقتور اور بڑی اور کتنی ہی
نیاب اور رحمدل کیوں نہ ہو ان حالات کی صورت کو تبدیل کر سکتی ہے؟ خواہ
وہ اپنا جمہوری ہی کیوں نہ ہو کیا کوئی بھی اسکا قانون سرمایہ داروں کے دلوں سے
خودغرضی کو نکال سکتا ہے؟ - کیسے غضب کی بات ہے کہ اگر سرمایہ دار کبوتر
پالتا ہے تو کہتا ہے مجھکو کبوتروں کا شوق ہے اور اگر کوئی غریب اپنے بچوں کو بہلانے
کے لئے بھی کبوتر پالتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ کبوتر باز ہے - ادھر سرمایہ دار
کی خودغرضی کی وجہ سے ہزاروں ہندوستانی بھیک مانگ کر ہی اپنی گزر اوقات
کیلئے مجبور ہیں - ادھر سرمایہ دار قانون بنواتا ہے کہ بھیک مانگنا جرم قرار دیا جائے -
ادھر تو لوگ فاقوں مرتے ہیں اور جاڑوں میں بن کپڑے ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں
ادھر سرمایہ دار کے کتوں کو وہ کھانا ملتا ہے اور وہ مسہری ملتی ہے اور اپنے
گھوڑوں اور بلیوں کو وہ قیمتی اور ستھری جھولیں دیتا ہے جو ایک وسط درجہ
کا ہندوستانی اپنے پہننے کے لئے بھی نہیں پا سکتا غریب کا تو ٹھکانا ہی کیا ہے!
اس جہالت اور خودغرضی اور خودپرستی کی انتہا ہو چکی ہے اور نہ کوئی انتہا - جانوروں
کے مقابلہ میں بھی انسان کی کوئی حقیقت نہیں سمجھی جاتی اور نہ کوئی اسکی فکر ہے -
اور نہ اسکی ضروریات اور تکالیف کا کوئی احساس ہے - اور کیا یہ واقعہ نہیں ہے
کہ ادھر تو سرمایہ دار کی خودغرضی نے اسکے ملک کے رہنے والوں کو چوری ڈکیتی
اور لوٹ مار کے لئے مجبور کر دیا ہے - وہ [illegible] کی بات ہے کہ وہ بھی ہم آپ
انسان ہیں انکو ان جرائم کے کرنے میں کچھ لطف نہیں آتا - بلکہ بیچارے اپنے
معصوم بچوں کا پیٹ ہی پالنے کے لئے ایسے فعل کرا دیتا ہے ادھر تو ناقدشناس

پہنچاتی ہے اور خصلت پیشہ ہو جاتی ہے ۔ اُدھر سرمایہ دار قانون اور جیل کے ذریعہ اُن جرائم کو رُکوانا چاہتا ہے ۔ بلکہ جس کی وجہ سے جرائم دن بدن بڑھتے ہی جاتے ہیں ۔

ہم اس موقعہ پر نہ صرف اپنے سرمایہ داروں کو بلکہ موجودہ اور آئندہ آنے والے جمہور کو بھی متنبہ کر دینا چاہتے ہیں کہ جرائم قانون اور جیل سے کبھی نہیں رُک جا سکتے جبتک کہ ان وجوہ کو دور نہ کیا جائے جنکے باعث انکا ارتکاب ہوتا ہے ۔ درخت کی شاخوں کو آپ کاٹتے جائیں درخت اور بڑھتا جائیگا ۔ اگر درخت کو نیست و نابود کر دینا مدنظر ہے تو آپ اسکو جڑ سے اکھاڑیں ۔ اسیطرح اگر انسان کو پیٹ بھر کھانا ملنے کی سبیل نکال دی جائے اور اُسکا وقت اس کام میں صرف ہو اور ساتھ ہی ساتھ اُسکے خیالات بھی نیک اور پاکیزہ بنائے جائیں اور خوف اور خود غرضی دونوں اُسکے دل سے نکال دی جائیں تو ایسی حالت میں جرائم کا ارتکاب کم اور بند ہو سکتا ہے ۔ اور جرائم پیشہ لوگوں کو نیک بنانے کی توقع بھی اُسی وقت ہو سکتی ہے جبکہ ہم اور ہمارے سرمایہ دار دونوں کے دل خود غرضی سے پاک ہوں ۔ ہمارا یہ بھی کہنا ہے کہ راجہ یا جمہور یا انجمن کو کوئی حق اسبات کا نہیں ہے کہ وہ چوری کے جرم کی سزا مقرر کرے ۔ جبتک کہ اُسکے اور اُسکے بچوں کے لئے پیٹ بھر کھانا اور دیگر ضروریات کو پورا کرنے کا کوئی طریقہ یا سبیل اسکے لئے مہیا نہ کر دی جائے ۔ مثلاً آپ اسیطرح جیسے ہم سرکار اور سرکاری دفتر کے چھوٹی تنخواہ دار دل سے رشوت نہ لینے کی امید نہیں کر سکتے تا وقتیکہ اُنکی تنخواہ انکی معمولی گزراوقات ، بچوں کی تعلیم وغیرہ

کی ضروریات کو پورا نہ کر سکے ۔ ورنہ ہماری یہ خواہش کہ چوری چوری نہ کرے یا رشوت
بند ہو جائے ایک تمسخر سے بدتر ہے اور ظلم ہے ۔ بجنسہ بھیک مانگنے کو جرم قرار
دینا اُس وقت تک کفر ہے جب تک کہ ہم وہ وسائل نہ اختیار کریں جن سے ہماری
ہم وطنوں بھائیوں بہنوں اور بچوں کو نہ صرف اپنے پیٹ پالنے کے اور نہ صرف
اپنی تساہلی اور عادت کے اُنکو بھیک پر گزر اوقات کی ضرورت ہی باقی رہے ۔

اپنے ملک میں اس زمانہ میں بھی جو روشنی اور ترقی کا زمانہ بولا جاتا ہے
کیا ایسے راجوں مہاراجوں، نوابوں، رئیسوں، بڑے بڑے تاجروں اور
مذہبی پیشواؤں اور مندروں کے پجاریوں اور ہونہار اسکے ٹھیکہ داروں کی
کمی ہے جنکی دولت اور ثروت بے اندازہ ہے مگر اُن کا ذاتی عیش اور
تزک و احتشام بھی ویسے ہی بے اندازہ ہے ۔ اور جسکو دیکھ کر غیر ملک اور
انگریز بھی کہتے ہیں کہ ہندوستان میں مفلسی نہیں ہے جس سے انکا مطلب
صاف یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں افلاس ہے تو اُسکی ذمہ داری اُسکے اُن
سرمایہ داروں کے سر ہے جو اپنی دولت کا مناسب استعمال نہیں کرتے بلکہ انکا
ناجائز استعمال کرتے ہیں ۔ اور نہیں تو اُسکو زمین میں دفن رکھتے ہیں ۔ کیا ہندوستان
کے ایسے سرمایہ دار نہیں سمجھتے کہ دنیا میں خدا بھی ہے ۔ کیا وہ یہ خیال نہیں کرتے
کہ سب کو ایک دن مرنا ہے ؟ ۔ کیا آپکو یہ خیال نہیں آتا کہ ملک کے افلاس
کی بددعا نے بڑے بڑے بادشاہوں تک کے تخت اُلٹ دیئے ۔ اور بڑے سے
بڑا بادشاہ سزا و جزا اور موت کے پنجہ سے بچ نہیں سکا ۔ غریبوں کی آہوں نے
بڑے بڑے ملک نیست و نابود کر دیئے ۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہندوستان کے

افلاس کی بد دعا ان سرمایہ داروں کی زمینوں میں گڑی دولت کے سینہ پر داغ نہ ڈالدیگی؟ کیا ہندوستان کا افلاس اور اسکی کلفتیں انکی پیشانی پر ایک دلخراش دھبہ نہیں ہے؟۔ کیا ہندوستان کے افلاس کی بد دعا انکے امارت کے چراغ کو بجھا نہ چھوڑیگی؟۔ کیا اپنے ملک کے افلاس کی آہ انکے تہ خانوں میں بیکار پڑے ہوئے ہیروں اور جواہروں میں شعلے نہ لگا دیگی؟ کیا ہندوستان کا سوگ انکے تالے میں بند پڑے سرخ دیناروں میں انگارے نہ دہکا دیگی؟ کیا غلامی کا قہر، کیا آئے دن کا قحط، آئے دن کا طاعون اور ہیضہ اور تپ دق ملیریا، زلزلہ، خانہ جنگیاں اور قومی لڑائیاں آنکو خواب غفلت سے اُٹھانے کے لئے کب تک اور کتنے دنوں تک قاصر رہینگی؟۔ نہیں تو پھر وہ کونسا قہر خدا اس ملک پر ٹوٹنے کو اور باقی رہ گیا ہے جسکا انکو انتظار ہے۔ ہندوستان کے دولت والو جنکا سرمایہ اور جنکی بیشمار دولت زمین میں دفن ہے اُن سے میں یہاں سے کہتا ہوں کہ میں نے موجودہ واقعات کا یہ نقشہ کسی طرح پر بھی کسی کو تکلیف دینے یا کسی کی دقت لینے کے لئے نہیں کھینچا ہے بلکہ صرف اسلئے کہ اب بھی موقع ہے اور وقت ہے کہ سمجھو اور غور کرو کہ خدا نے تمکو دولت اسلئے نہیں بخشی ہے کہ تم اُسکو عیش و عشرت یعنی نفس پرستی میں اور خود پرستی میں صرف کرو یا اسکو زمین میں بیکار گڑا رکھو بلکہ یہ توفیق تو اُس نے آپکو اسلئے دی ہے کہ اس دولت کو مناسب طور پر یعنی خدا کے بندوں پر صرف کرو۔ اور اسکے بندوں کو بھی اپنا بھائی سمجھو یا دریا چھوٹا اور بیکس بھائی سمجھکر اُن سے بھائی ایسا اور انسان ایسا برتاؤ کرو۔ اور خود غرضی اور خود پرستی اور جہل کو اپنی زندگی کا شعار نہ بناؤ۔

ہندوستان کی تمام تکالیف اور جملہ برائیوں اور جھگڑوں کی اصلی علت یعنی کارن ہے ۔ اور جو نہ کسی شخصی حکومت اور نہ جمہور کے بس کی بات ہے ۔ یہ تو اپنے ہی ہاتھ کی بات ہے اور اپنے ہی دل کی بات ہے ۔ اسلئے ثابت ہے کہ ہماری اور ہر قوم اور ملک کی غلامی کی اگر کوئی وجہ اور سبب ہے تو اس قوم اور ملک کی افرادی خود غرضی ہے ۔

وہ سرمایہ رکھنے والے سرمایہ دار بھی خود غرض نہیں ہیں

میں گذارش کر چکا ہوں کہ سرمایہ داری اصل میں دل کی بات ہے نہ کہ سرمایہ کی ۔ کیونکہ سرمایہ یعنی دولت تو ایک بہت بڑی اور خدا کی خاص بخشش اور نعمت ہے ۔ بشرطیکہ اسکا استعمال مناسب ہو ۔ اور یہ نعمت صرف اسوقت لعنت ہو جاتی ہے اور باعث قہر ہو جاتی ہے جبکہ وہ خود غرضی اور خود پرستی کے برے کاموں میں صرف کیجائے ۔ اپنے ملک میں اس بری اور گری حالت میں بھی ایسے سرمایہ دار یعنی دولت اور ثروت رکھنے والے اسوقت موجود ہیں جو دل سے سرمایہ والے بھی خود غرض نہیں ہیں ۔ آجکل بھی ہندوستان میں بڑے بڑے مہاراجے راجے ، نواب ، تعلقہ دار اور امیر اور بڑی بڑی مل والے اور بڑی بڑی ثروت والے اور بڑی بڑی تجارت کرنے والے موجود ہیں جو مندر ، مسجد ، گرجے ، سرائیں ، دھرمشالے ، [illegible] ، کنوئیں ، ہسپتال ، اسکول اور کالج اور یتیم خانے وغیرہ رفاہ عام کے واسطے بنواتے ہیں ۔ اور انکے اخراجات متعلقہ کو بھی خوشی خوشی برداشت کرتے ہیں ۔ اور اپنے راج اور گاڑھی کمائی کا لاکھوں اور کروڑوں روپیہ ملک کے بچوں کی تعلیم اور جملہ اقسام کی ترقی پر صرف کرتے ہیں ۔ لاکھوں روپیہ کا

دان دیتے ہیں۔ سرمایہ بانٹتے ہیں۔ لاکھوں اوسط درجہ اور فرد و پیشہ
لوگوں کی انکے ذریعہ پرورش ہوتی ہے۔ نہ معلوم کتنے اہل قلم اور شعرا اور اہل فن
کی یہ لوگ سرپرستی کرتے ہیں اور کروڑوں روپیہ ملک کی آزادی اور بہبودی
اور چلاتے ہوؤں پر کھلے دل سے نچھاور کرتے ہیں۔ اور لاکھوں طریقوں سے اپنی گاڑھی
کمائی کا روپیہ اپنے ملکی بھائیوں کی بھلائی اور انکی امداد میں صرف کرتے ہیں۔ یہ
بڑی بڑی ثروت والے اپنی جان اور مال اور اپنا سب کچھ ملک و مالک اول
پر قربان کرتے ہیں۔ یہ سب لوگ خدا پرست، خدا ترس اور خدا دوست ہیں۔
اور خدا کے بندے کو اپنا بھائی سمجھکر اسکے درد میں شریک ہوتے ہیں۔ اور دراصل
یہ انھیں کی نیکی کی برکت ہے جو ہندوستان قائم ہے اور ہم تہذیب اور ترقی
کے میدان میں بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ کم از کم میرے منہ میں اتنے دانت نہیں
جو میں ان فرشتہ سیرت نیک لوگوں کو سرمایہ دار یعنی خود غرض کہہ سکوں۔ اور
میرے خیال میں کوئی بھی انکی طرف انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ اور جو لوگ ان اچھے مخیر
لوگوں کے بھی مخالف ہیں وہ گویا اپنے ملک کی جڑیں کاٹ رہے ہیں۔ وہ اسی
شاخ کو کاٹ رہے ہیں جس پر وہ کھڑے ہیں۔ وہ اسی ہاتھ کو کاٹتے ہیں جو ان کو
دودھ پلاتا ہے۔ ہمارے لئے تو دونوں امیر و غریب ایک ہیں۔ دونوں ہی ہمارے
بھائی ہیں۔ اور ہماری خواہش اور ہماری کوشش تو صرف یہ ہے کہ نہ تو ہمارا
امیر اور نہ ہمارا غریب، امپیریلسٹ یعنی سرمایہ دار یعنی خود غرض ہو۔ ہم تو
چاہتے ہیں اور ہماری اس کتاب کا مدعا بھی یہی ہے کہ دونوں ہی کے دل خودی
اور خود غرضی یعنی امپیریلزم سے پاک ہوں۔ دونوں ہی خدا کے بندے ہیں۔"

اور دونوں ہی کو جو کچھ دیا ہے خواہ دولت دی ہو یا تنگی وہ اسی نے دی ہے ۔
اگر افلاس یا غریبی نہ رہے تو امیر ثواب کیسے حاصل کرے ۔ اور امیر نہ رہے
تو غریب کیسے جیئے ۔ دونوں کی موجودگی ایک قدرتی امر ہے ۔ دنیا میں جہاں
پہاڑ ہے وہاں وادی بھی ہے ۔ جہاں ہاتھی ہے وہاں چیونٹی بھی ہے ۔
نہ دولت ہی والے مٹ سکتے ہیں اور نہ مفلس ۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے
کہ سب انسانوں کا ایک ہی قد اور ایک ہی شکل کا ہو جانا غیر ممکن ہے
کیونکہ ہر شخص ہی اپنی تقدیر علیحدہ علیحدہ لاتا ہے ۔ یہ قانون قدرت ہے ۔ کوئی
بھی بڑے سے بڑا انسان یا بڑے سے بڑا ملک یہ چاہے کہ دنیا کے سب
پھول سرخ ہی سرخ یا سفید ہی سفید یا کالے ہی کالے ہو جائیں تو ناممکن
ہے ۔ بلکہ قدرت نے مختلف سیکڑوں رنگ اور مختلف لاکھوں شکلیں
اسلئے بنائی ہیں تاکہ دنیا کے لوگ سب ہی پھولوں کے ایک ہی رنگ اور شکل
کے ہونے کی وجہ سے گھبرا اور اکتا نہ جائیں ۔ اور اسی اصول کے مطابق
جملہ ممالک و قومیں اور خاصکر ہندوستان کے رہنے والے نہ معلوم کتنے
میلے اور تماشے اور نہ معلوم کتنے تیج اور تیوہار ہر موسم کے مطابق مناتے ہیں ۔
تاکہ سال کے تین سو پینسٹھ ۳۶۵ دنوں کو برتنے ۔ رہنے سہنے اور کھانے پینے میں تبدیلی
ہوتی رہے ۔ اسلئے روپیہ یا کسی چیز کی زیادتی یا کمی اپنی اپنی تقدیر اور اپنے
اپنے سنسکاروں اور حکم قدرت پر منحصر ہے ۔ اور جو شخص یا جو ملک قدرت کا
مقابلہ کرتا ہے یا اسکے برعکس جانا چاہتا ہے وہ اپنا وقت بیکار کھوتا ہے
اور نقصان جان و مال اٹھاتا ہے ۔ کیا کبھی یہ ممکن ہے کہ انسان کی

کوشش سے آگ کی لو اوپر اٹھنے کے بجائے نیچے کی طرف جائے یا پانی نشیب
میں جانے کے بجائے اونچے کی طرف بہنے لگے۔ انھیں اصولوں پر دنیا کے سب
ہی لوگوں کو امیر بنا دینا یا انکو مفلس بنا دینا یا انکو دولت کے بارے میں برابر
رکھنا یہ بات انسان کی طاقت کے قطعی بالکل باہر ہے۔ اور نہ کسیطرح کبھی یہ ممکن
ہو سکتا ہے۔ بلکہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔ البتہ یہ اپنے ہاتھ کی بات ہے
کہ ہم خود گیان حاصل کر سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی گیان حاصل کرا سکتے ہیں۔ خود
بھی نیک بد اور حق و ناحق میں تمیز کر سکتے ہیں اور دوسروں کو بھی تمیز کرا سکتے
ہیں۔ اور یہ تو بالکل اپنے ہی ہاتھ کی بات ہے اور اپنے قابو کی بات ہے کہ ہم
خود غرضی کو کم از کم اپنے دلوں سے نکال دیں اور جسطرح وائرلیس اور ریڈیو کے ذریعہ
دنیا کے ہر حصے سے سب خبریں خود بخود ہمکو ملتی ہیں اور ہمکو تعجب معلوم ہوتا ہے
اور ٹھیک اسیطرح جیسے کہ لکھنؤ کے تارگھر میں بیٹھے ہوئے جب تار کی مشین پر
"ڈاٹ" بجاتے ہیں تو بمبئی کے تارگھر کی مشین میں بھی "ڈاٹ" بجتا ہے۔
اور جب "بار" بجاتے ہیں تو وہاں بھی "بار" بجتا ہے۔ اسیطرح جب ہم اپنے
دلوں سے ذاتی خود غرضی کو نکال دیں گے تو یقین مانئے کہ ہمارے رئیس امراء ہمارے
امیر ہمارے راجے اور نواب وغیرہ کے دلوں سے خود غرضی خود نکل جائیگی۔ بالکل
ہی تعجب کی بات نہیں ہے۔ بلکہ یہ قانون قدرت ہے کیونکہ دل کو دل سے راہ
ہوتی ہے۔

اسلئے ہماری تو یہ تمنا ہے یا ہماری غرض یہی ہے کہ دولت والوں کی دولت
دن دونی اور رات چوگنی ہو مگر انکے دل خود غرضی سے پاک ہوں۔ انکے دل نرم

رہیں۔ اور یہ لوگ اپنے ملکی بھائیوں کے درد کو اور انکی تکلیف کو اپنا درد اور تکلیف سمجھیں۔ اسلئے خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ امپیریلزم یا سرمایہ داری دلکی بات ہے اور باقی اسکا کوئی وجود نہیں، اور نہ کوئی حقیقت ہی ہے۔ دنیا کی کوئی شئے بھی دولت طاقت اور سب کچھ بُرے نہیں ہیں بشرطیکہ اُن کا استعمال جائز ہو مناسب ہو اور عوام کی بہتری کے لئے ہو۔ قدرت نے بھی جتنی چیزیں دنیا کو بخشی ہیں وہ سب ہی انسان کی بھلائی اور ترقی کے لئے بخشی ہیں۔ اسلئے قدرت کا منشا ہی یہ ہے کہ سورج چاند اور تارے اور دریاؤں وغیرہ کی طرح دولت، طاقت اور حکومت سے جو کچھ بھی کام ہو وہ انسان کی بہبودی کے لیئے ہو اسمیں خود غرضی شامل نہ ہو۔

ہندوستان و نیز دیگر ممالک عرب وغیرہ میں بلکہ دنیا میں ایسے بادشاہ اور مہاراجے اور راجے گزرے ہیں جنکی مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں جو بڑے بڑے ملکوں کے بادشاہ یا حاکم ہوتے ہوئے بھی اپنی اور اپنے گھر والوں کی گزر اوقات صرف اُسی پیسے سے کرتے تھے جسکو وہ اپنے ہاتھ کی محنت سے کماتے تھے، موٹا کھاتے تھے موٹا پہنتے تھے۔ اور انصاف و ایمان کو اپنی حکومت کا داہنا اور بایاں بازو سمجھتے تھے۔ اس بات سے بھی یہ ثابت ہے کہ سرمایہ داری در اصل اپنے دل کی بات ہے کسی اور شئے دولت یا طاقت یا حکومت کے ہونے یا نہ ہونے پر منحصر نہیں ہے۔

ایک مفلس بھی سرمایہ دار یعنی خود غرض ہو سکتا ہے

جو لوگ مفلس ہیں یعنی جنکے پاس سرمایہ نہیں ہے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا

کی دولت اور پیداوار دنیا کے رہنے والوں میں اگر برابر تقسیم ہو جائے تو دنیا میں امن چین اور شانتی رہیگی۔ بلکہ اکثر لوگوں اور ملکوں کی خواہش یہ ہو رہی ہے کہ یا تو وہ خود اپنی طاقت سے یا انکی گورمنٹ خود ہی سرمایہ داروں سے انکی دولت اور زمینیں لیکر انہیں اور ملک کے دوسرے باشندوں میں برابر برابر تقسیم کر دیں۔ یا کوئی ایسی ترکیب نکالیں جس سے امیر اور غریب جائداد اور دولت کے لحاظ سے برابر ہو جائیں۔ کیا یہ بات ممکن ہے؟ جو لوگ آج مفلس ہیں اگر وہ سرمایہ داروں سے انکا سرمایہ خود چھین لیں یا اپنی حکومت کے کسی قانون کے ذریعہ انکی دولت اور روپیہ پیسہ تقسیم کرالیں تو کیا یہ اغلب نہیں ہے اور کیا اسبات کا خوف نہیں ہے اور کیا یہ قدرتی بات نہیں ہے کہ وہ لوگ خود بھی پوری پوری سرمایہ داری میں رفتہ رفتہ گرفتار نہ ہو جائیں؟ کیا یہ دور کبھی بند ہو سکتا ہے؟ میرے خیال میں ان حالتوں اور صورتوں میں اگر آج ایک سرمایہ دار ہے تو کل وہی مفلس ہوگا۔ جو آج مفلس ہے کل سرمایہ دار ہوگا۔ یورپ اور امریکہ اور دیگر آزاد ملکوں میں خاصکر ایسی بہت سی ہستیوں کی مثالیں موجود ہیں جو مزدور طبقہ کے لوگ تھے جنکی اوائل عمری میں انکے کھانے پینے تک کا اور تعلیم حاصل کرنیکا کوئی معقول ذاتی ٹھکانہ نہ تھا۔ اور جو اپنے ہاتھ پیر کی کوششوں سے نہ صرف مزدور طبقہ کے بڑے بڑے رہنما ہوئے اور ہیں بلکہ اپنے اپنے ملکوں میں وزیر، وزیر اعظم و نیز جمہور کے پریسیڈنٹ تک ہوئے ہیں اور ہیں۔ مگر جن کا شمار زیادہ تر سرمایہ داروں اپنی امپیریلیسٹ میں ہوتا ہے۔ اور وہ امپیریلسٹ ہیں۔

وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی و اپنی پارٹی اور اپنی حکومت کی زندگی کا مدعا
صرف روپیہ پیسہ ہی بنا رکھا ہے۔ اگر مزدور طبقہ کی گورنمنٹ انکے ملک میں
قائم ہو گئی ہے یا پھر آئندہ ہو جائے تو کیا اس ملک اور اسکے طرز حکومت اور
رویہ میں کوئی خاص تبدیلی ہو گی۔ یا امن چین اور شانتی ہو سکے یا ہو جانے کی کوئی
امید ہے؟ ظاہر ہے نہ ہوئی ہے نہ ہونے کی امید ہے۔ کیونکہ یہ بات تو کسی
دنیوی طاقت کے قطعی باہر ہے کہ وہ کسی انسان قوم یا ملک کی روپیہ پیسہ یا طاقت
کی ہوس کو کسی طرح پیٹ بھی اور کسی وقت میں بھی پورا کر سکے۔ اسلئے خوب اچھی طرح سمجھ
لینا چاہیئے کہ سرمایہ داری یعنی خودغرضی اصل میں اپنے اپنے دل کی بات ہے۔
نہ کہ روپیہ پیسہ ہونے یا نہ ہونے کی بات ہے۔ ہندوستان کی مثال ہمارے
سامنے ہے۔ کہ جو اسٹرائکیں کارخانوں اور ملوں وغیرہ میں برٹش گورنمنٹ کی شخصی
حکومت کے زمانہ میں ہوئی تھیں اور وہ اُس دوران میں ہی ہوئیں اور زور
کے ساتھ ہوئیں۔ جبکہ صوبوں میں صوبہ جاتی حکومت تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اصل میں
یہ اسٹرائکیں زیادہ تر روپیہ پیسہ کی غرض سے اور رقابت اور نفسانفسی کی
وجہ سے کرائی گئی تھیں یا ہوئی تھیں۔ اسلئے صوبجاتی حکومتوں کے زمانہ میں
بھی بدستور ہوتی رہیں۔ اگر ان اسٹرائکوں کی غرض صرف آزادی ملک یا کوئی اور
نیک یا اونچی وجہ ہوتی تو اول تو صوبجاتی حکومت کے وقت میں یہ ختم ہوتیں۔
اور اگر ہوتیں بھی تو ان کے طرز و طریق آئین اور پالیسی میں اور رویہ میں ضرور
ہی زمین و آسمان کا فرق رہتا۔ اسلئے چاہیے مزدور پیشہ طبقہ کی گورنمنٹ ہو یا کسی
اور طبقہ کی گورنمنٹ کیوں نہ ہو جبتک وہ روپیہ پیسہ کو مدعا زندگی کے اوپر نہ اٹھیگی اور اسکے افراد

خودغرضی سے پاک نہ ہونگے اُس ملک میں نیز ہندوستان میں امن چین سُکھ
اور شانتی نہیں آسکتے۔

ایک جمہوریت بھی سرمایہ داری یعنی خودغرض ہو سکتا ہے

صرف بطور تمثیل کے گزارش ہے کہ چند سال قبل غیر اور ہندوستان کا بھی ایک
طبقہ یہ سمجھتا تھا کہ جیسا سُننے میں آیا ہے کہ جمہور روس میں کل دولت اور زمین
گورنمنٹ نے لے لیں سب کو روٹیاں کپڑے ملتے اور زندگی کے ضروری
اشیاء برابر برابر تقسیم ہونے لگے بچوں کی تعلیم و تربیت کے شخصی افکار
گورنمنٹ نے اپنے سر لے لیئے۔ اور اسلئے وہ جمہور گویا باغ ارم بن گیا۔ مگر
ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ وہاں کُشت و خون، مار دھاڑ اور
چوٹی کے لوگوں سے لیکر نیچے تک بغاوت اور بے اعتباری، جیل اور پھانسیاں
اور قتل وغیرہ ابھی تک کم نہیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں کے لوگ سب سُکھ
کی نیند نہیں سوتے ہیں۔ سُنا گیا ہے کہ وہاں کے ڈکٹیٹر تک کو ہر گھڑی اور
ہر لمحہ اپنی جان کا خوف ہے۔ اور وہ خود زبردست سے زبردست پہرے والوں
میں مقید رہتا ہے۔ اور وہ اکیلا اور کھلے میدانوں میں کہیں کبھی نہیں نکل سکتا۔
یا آجا سکتا۔ پھر روس کیا اور کیا باغ ارم بنا جہاں کے حکمراں بادشاہ کی بھی جان
اُسی کے ملک میں ہر وقت خطرہ میں ہے۔ اُسکا دعویٰ کہ اُسکو اور اُسکے لوگوں کو
ملک گیری کی تمنا نہیں تھی یہ بھی غلط ثابت ہوا۔ کیا اُس نے پولینڈ کا آدھے
حصہ کو دبوچ نہیں لیا؟ اور کیا اُس نے اور سرمایہ دار ملکوں کی طرح فنلینڈ پر

اسکی آزادی سلب کرنے کے لئے اور اپنی حکومت کی خود غرضی کو پورا کرنے کیلئے
حملہ نہیں کر دیا اور اسکا بہت سا حصہ دبا نہیں لیا؟ جس وجہ سے اسکے ہندوستان
اور ولایت کے بھی ہم نوا اور ہم خیال طبقہ میں ہیجان اور استعجاب پیدا نہیں ہو گیا؟
اسلئے صاف ظاہر ہے کہ نہ تو اس جمہوریت اور نہ اسکے باشندوں کے دلوں سے
خود غرضی مفقود ہوئی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس بارہ میں یہ بھی ممکن ہے کہ جو جو
مندرجہ بالا باتیں ہم نے جمہور روس کے بارے میں سنی ہیں وہ سب ہی صحیح
نہ ہوں اور وہاں کے باشندوں کو انکی دنیوی زندگی میں وقتی امن و چین
اور اطمینان حاصل ہو گئے ہوں مگر اسمیں تو کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ اس
امن اور چین کو قیام حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ بھی اسیطرح زوال پذیر اور
چند روزہ ثابت ہوگا جیسے کہ ہمارا جسم اور اسکے متعلق خوشی زوال پذیر اور
چند روزہ ہیں۔ اور اس بات میں بھی کلام نہیں ہو سکتا کہ وہ ارتباط باہمی یا
میل جول بھی زوال پذیر اور عارضی ہوگا جو رواجاً یا کسی وبا وغیرہ یا کسی قانون
کے خوف سے ایکدوسرے کے ساتھ برتا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بھی قدرتی نہیں
ہوتا۔ اور از خود پیدا نہیں ہوتا۔ اور وہ بھی ایسے ہی بگڑتا ہے جیسے کہ ایک
جسم جسمیں جان نہ ہو۔ اسلئے ایک جمہور بھی اگر اسکا نظریہ صرف جسم تک محدود
ہے۔ بالفاظ دیگر اسکا معیار زندگی صرف روپیہ پیسہ ہی ہے اور مادہ پرستی
اور دہریت پہ مبنی ہے یعنی خدا کی ہستی ہی سے وہ منکر ہے تو اسکے افراد خود غرضی
کے طبقہ کے اوپر نہیں اٹھ سکتے۔ یعنی انھوں نے یہ تسلیم نہیں کر لیا ہے اور
اپنے دلوں میں مستحکم نہیں کر لیا ہے کہ خود پرستی کے مقابلہ میں ترک کا طبقہ اور اسکا

لطف کہیں بالاتر ہے۔ اور یہ بھی امر مسلّمہ ہے کہ خود غرضی وغیرہ کا اپنے دلوں سے
فنا ہونا ہی روحانی منزل کا پہلا زینہ ہے۔ اور جو بشریت کا خاص امتیاز بھی ہے۔
کیونکہ خداوند عالم نے انسان کو عقل اور روح دونوں زائد عطا کر کے جملہ بقیہ خلقت پر امتیاز
بخشا ہے تاکہ وہ یہ سمجھے اور یقین کرے کہ جسم اور اسکو برقرار رکھنے والے اشیاء
روپیہ پیسہ کھانا پینا اور کپڑے لتے دونوں ہی کو قیام حاصل نہیں کبھی ہیں کبھی
نہیں۔ مگر انکے مقابلہ میں زندگی کے جن ضروری اشیاء کو قیام حاصل ہے وہ
سچائی۔ راستبازی۔ نیکی۔ رحم۔ ایمان۔ ترس۔ اور بے لوث پریم وغیرہ ہیں۔ اور
انھیں نیک اوصاف کے ہونے سے انسان کو سچا اور مستقل آنند مل سکتا ہے۔
اسلئے جب تک کہ کسی بھی ملک یا جمہور کا معیار زندگی اگر روحانی نہ ہوگا یعنی وہ
خداوند عالم کی ہستی میں اعتبار اور یقین نہ کریگا تو نہ وہ خود غرضی کے ادبار سے اٹھ سکتا
ہے اور نہ پھر اسکو حقیقی شانتی اور چین جنکو دوام حاصل ہے میسر ہو سکتے ہیں۔

ہم ہندوستانیوں کی کمال درجہ کی سیاسی بدقسمتی اور گھور دکھ کا سامنا ہے کہ ملکی
اور غیر ملکی چند سیاحوں نے ہندوستان کو اپنی ذاتیات اور نجی ضروریات اور تجربات
کا تختۂ مشق بنا رکھا ہے۔ اپنے انگریزی مطبوعہ ۲۷ فروری ۱۹۳۷ء جس میں
میں نے رہنمایان کانگریس کو وزارت قبول کر لینے اور ممبران اسمبلی کے آئندہ طرزِ عمل
اور طور و طریق پر اور وزارت کے آئندہ کاموں کے پروگرام پر تھوڑی سی روشنی
ڈالی تھی۔ انھیں میں سے یہ بھی اپنے کمال افسوس کا اظہار کیا تھا کہ ہندوستان
نے ابھی پوری آزادی تو حاصل کی ہی نہیں ہے مگر چند کمیونسٹ لوگ چاہتے
ہیں کہ ہندوستان کمیونسٹ ہو جائے۔ اور بالشوک اور سوشلسٹ وغیرہ

چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا آئندہ طرزِ حکومت بالشویک یا سوسلسٹ ہو۔
یہ تو ایسی ہی اُلٹی بات ہے جیسے کوئی گاڑی چلنے کی اُمید میں گاڑی کو گھوڑے کے
آگے رکھدے۔ میں نے اپنے مذکورہ رسالہ میں یہ بھی صاف صاف لکھا تھا کہ
ہندوستان میں آئندہ کیا اور کس طرح کا طرزِ حکومت ہونا چاہئیے یہ تو اُسکی
رعیت ہی طے کریگی اور پھر یہ اسوقت طے ہوگا جبکہ وہ آزادی کے میدان میں
اپنا قدم جما چکا ہو۔ ہندوستان کے بھنگی اور اُسکے براہمن، اُسکے راجے اور
اُسکے کسان، اُسکے مل والے اور اُسکے مزدور، اُسکے ہندو، سکھ، عیسائی
اور مسلمان اور انگریز وغیرہ سب ہی ملکر طے کرینگے کہ وہ ہندوستان میں کس قسم کا
طرزِ حکومت چاہتے ہیں۔ تاکہ سب کے سب سُکھ سے رہ سکیں۔ اور سب ہی کو
مقبول کی پوری پوری آزادی حاصل ہو۔ اور پھر نہ معلوم اُسوقت وقت کا کیا تقاضا
ہو۔ یہ تو وہی بات ہے کہ شادی طے ہونے سے پیشتر بارات کا انتظام ہو رہا ہے
میں نے اُسی انگریزی رسالہ میں ہندوستانی کمیونسٹوں اور بالشویکوں وغیرہ کے
خیال کے لوگوں سے عاجزانہ اپیل کی تھی کہ خدا کے واسطے وہ ہندوستان پر رحم
کھائیں اور اُسکی خطاؤں کو معاف کر دیں۔ اور اپنے مغربی بس کی گانٹھ کو اس
دیش میں نہ کھولیں مگر یہ لوگ کب بھلا ماننے والے تھے یہ تو اور ضد پر چڑھ گئے
اور اب تو بہت سے مختلف ناموں کے لیبل اپنی اپنی گردنوں میں لٹکائے
ہوئے ہیں اور صاف صاف نظر آتا ہے کہ زیادہ تر ان لوگوں میں "میں"
"میرا" اور "مجھکو" یعنی خود غرضی اور خودی سمائی ہوئی ہے۔ یہ تو اپنی اپنی ذاتی
کھچڑی الگ ہی پکانا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ اور اُن کے رفقاء کمیونزم اور بالشوزم

سے دہکتے ہوئے انگارہ کی مہلک سوغات غیر ملکوں سے لے آتے ہیں جنکی
آگ کے شعلوں نے ان ملکوں کی راحت چین اور سکون کے خرمن کو خاک سیاہ کردیا
ہے - اور جو ہماری اور انکی دونوں کی آنکھوں کے سامنے ہے ۔ مگر وہ لوگ زیادہ تر
اپنی خودی میں اسقدر دبے ہوئے ہیں کہ انکو یہ دکھلائی نہیں دیتا کہ ہندوستان
کی ۳۵ کروڑ آبادی میں شاید ہی ہزار دو ہزار ایسے لوگ نکلیں جو واقعی طور پر خدا کی
ہستی کو نہ مانتے ہوں پھر وہ تحریک اور اس طرز حکومت کی عمارت جسکا بنیادی
پتھر ہی منکریت اور دہریت پر ڈالا گیا ہو وہ ہندوستان میں کیسے بن سکتی ہے
اور ہندوستان کے لئے کیسے موزوں ہو سکتی ہے - کیا وہ نادان لوگ یہ نہیں سمجھتے
کہ ہندوستان نے اپنی زندگی کا مدعا صرف تن پروری اور روٹی کپڑا ہی نہیں رکھا
تھا - بلکہ اسکا مدعا روح یعنی آتما کا سدھار یعنی روحانی ترقی اور آتما اور پرماتما کا
سمجھنا اور جاننا رہا ہے - اور جس خاص وجہ سے وہ اور اسکا روحانی کلچر دونوں
کروڑوں سال سے اب تک قائم ہے ۔ اور سب سے بڑا اور افسوسناک اور مہلک نتیجہ
جو ابھی سے ہم دیکھ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ان خودغرض لوگوں نے صرف اپنی شخصیت
اور اپنی سیاسی زیست کو اونچا رکھنے کی غرض سے اور رقابت اور نفسانیت کی بنا پر
بلا لیس و پیش ہندوستان کی سیاست اور آزادی کے مارچ میں کھلبلی ڈالدی، ہیجان
پیدا کر دیا اور ایک ہنگامہ برپا کر دیا - اور ایک مہلک تفرقہ ڈالدیا - اور جس بارہ
میں میں نے گزشتہ سال مارچ میں نیشنل ہیرالڈ میں ایک مضمون دیکر ملک کے
رہنمایان کو آگاہ بھی کیا تھا ۔ کہ اس تفرقہ کی وجہ صرف ذاتیات پر مبنی نہیں ہے
بلکہ اصولی ہے ۔ کیونکہ جن لوگوں نے عدم تشدد کو محض پالیسی کے طور پر اختیار کر لیا

وہ ذاتیات، خودغرضی اور نفسانیت کے اوپر نہیں اُٹھ سکتے - اور نہ اُن کو اپنی خودی اور خودغرضی کی تاریکی میں یہ دکھائی دیتا ہے کہ وہ اُس شاخ کو کاٹ رہے ہیں جس پر وہ کھڑے ہیں اور اُسی عمارت کو وہ ڈھا رہے ہیں جس کی بدولت وہ کچھ سمجھے جاتے ہیں۔ اور اُسی درخت کی جڑوں کو اُکھاڑ رہے ہیں جس نے اُن کو سایۂ عافیت بخشا ہے اور میوے عطا کئے ہیں - اور واقعہ ہے کہ ایک ہی مچھلی سارے تالاب کو گندہ کر دیتی ہے - اور ہندوستان کی سیاست میں تو نہ معلوم کتنی اور نہ معلوم کس کس رنگ اور ڈھب کی مچھلیاں ہیں۔ حالانکہ اب وہ وقت عنقریب ہے جبکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی علیحدہ ہو جائیگا۔ کیونکہ چھوٹی اور بڑی سب ہی سرکش اور بے پرواہ ندیوں کا بھی سمندر میں گر جانا اور اسمیں مل کے ہو جانا قدرتی بات ہے - جو ہم اپنی آنکھوں ہوتا ہوا دیکھ بھی رہے ہیں

قصہ کوتاہ واقعہ یہ ہے کہ روس ہو یا ہندوستان ہو کوئی بھی ملک ہو، ڈکٹیٹر ہو یا بادشاہ یا کوئی جمہور اور اسکا پریسیڈنٹ یا اُس جمہور کے باشندے ہوں، کوئی بھی ہوں۔ جبتک کہ اُنکا نظریہ روحانیت کا نہ ہوگا اور جبتک کہ اُن کا جہل دور نہ ہوگا وہ خودغرضی سے بالاتر نہ اُٹھیں گے۔ اور پھر وہ حق اور ناحق - نیکی اور بدی سُکھ اور دُکھ میں تمیز نہ کریں گے اور اُن خود کو بھی سُکھ، امن اور چین حاصل نہیں ہو سکتے۔ اسلئے جبتک کہ دنیا کے لوگ اپنی زندگی کا مدعا صرف روٹی اور کپڑے کا حاصل کرنا ہی رکھیں گے دنیا اُنکے لئے دوزخ ہی بنی رہیگی کسی بھی شہر یا ملک یا کسی بھی انسان کے جسم کو آپ جتنا بھی چاہیں آراستہ و پیراستہ کر دیں جبتکہ اُس شہر یا اُس ملک میں رہنے والوں اور اُن کے جسم کے اندر رہنے والی

روح کو آپ خودی اور خود غرضی سے پاک نہیں کرلیں گے یعنی بالفاظ دیگر آپ خود اپنی خود غرضی کو اپنے دل سے دور نہ کریں گے اسوقت تک اُس شہر اور اُس ملک کو شانتی اور چین میسر نہیں ہو سکتے۔ چاہے آپ ہاں شخصی حکومت بنائیں اور چاہے جمہوری اور اسبات کو اچھی طرح اپنے دل پر نقش کر لینا چاہیئے کہ کوئی بھی حکم اور کوئی بھی قانون اُس شہر کو یا اُس ملک کو غارت ہونے اور فنا ہونے سے بچا نہیں سکتے جبتک کہ اُسکے رہنے والے خودی اور خود غرضی کے بالاتر نہ ہو جائیں۔ اور جو بھی خونریزیاں اور مظالم مختلف قوموں اور مذہبوں اور ملکوں میں آپ کو اسوقت دکھلائی دیتی ہیں۔ اُن سب کے اصلی وجوہ کے بارے میں مجھکو یقین ہے کہ بڑوں اور چھوٹوں سب ہی کو عین الیقین اور حق الیقین ہو گیا ہوگا کہ ان سب کی وجہ اور ان سب کی علت یعنی کارن شخصی خود غرضی ہے۔ گویا دنیا بھر کے جرائم اور تکلیفوں اور غلامی وغیرہ کی جڑ شخصی خود غرضی ہے۔ اور یہ بھی آپ نے سمجھ لیا کہ جس جگہ کہ وہ خود غرضی پیدا ہوتی ہے اُبھرتی ہے، اُگتی ہے اور پھیلتی ہے وہ انسان کا دل ہے۔ اور اُسکو شاداب کرنیوالی جو شئے ہے وہ جہالت ہے۔ اور وہ جہالت یہ ہے کہ انسان نے اپنی زندگی کا مدعا صرف روٹی اور کپڑا بنا رکھا ہے۔ یعنی اُسکا نظریہ صرف جسم تک محدود ہے جس وجہ سے وہ حق ناحق۔ نیکی اور بدی میں تمیز نہیں کرتا۔ اسلئے ہم اس اٹل اور اہم نتیجہ پر آتے ہیں کہ اگر یہ ضرورت ہے اور خواہش ہے اور جو خواہش قدرتی ہے بلکہ قدرت کا منشا بھی یہ ہے کہ ہم اور ہمارا ملک اور دنیا تینوں دوزخی زندگی سے نجات پا کر ایک بہشتی زندگی بسر کریں تو ہر جوان اور مستقل رکھنے والے کا پہلا فرض اور پہلا فعل

یہ ہونا چاہئیے کہ وہ اپنے دل کو خودی اور خودغرضی سے قطعی پاک کردے
جسکا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بھی وہ خیال کرے یا کوئی بھی گفتگو کرے یا فعل کرے
اور جہاں کسی سے بھی وہ ملے اور جس کسی سے بھی وہ پیار کرے اُنمیں کوئی
خودغرضی شامل نہ ہو۔ یعنی کسی کا حق چھین کر کسی کو دکھ دیکر یا کسی کے ساتھ
بدی کرکے اپنی خواہش یا غرض یا ضرورت کو پورا نہ کیا جائے۔ اور نہ ایسا خیال
ہی کیا جائے۔ بلکہ خلاف اسکے اپنے ملنے والوں کی ضروریات کو اپنی گفتگو کا
خاص مرکز بنایا کریں اور اُنکی ان ضروریات کے پورے ہونے کا شوق اور سچائی
کے ساتھ صحیح مشورہ دیں اور حتی المقدور مدد بھی کریں۔ یہ باتیں ہر ایک انسان
کے اپنے ہاتھ کی باتیں ہیں۔ کوئی بھی انسان اپنے دل کو خودی اور خودغرضی
سے پاک کرکے دیکھ لے کہ پھر لوگ اس سے کیسی محبت کرتے ہیں۔ اُسکی بات کا
کیا اثر ہوتا ہے۔ اور اُسکی کیا عزت ہوتی ہے۔ اور اُس خود کو کیسی خوشی اور
شانتی نصیب ہوتی ہے۔ یہاں پر میں یہ بھی گزارش کردوں کہ آپ یہ کوشش
قطعی نہ کریں اور نہ اس فکر میں پڑیں! اور نہ یہ فکر ہی کریں کہ دوسرے لوگ اپنی
خودغرضی کو چھوڑیں۔ اُنکو تو آپ اُنھیں پر چھوڑ دیں۔ کیونکہ جیسے غصہ کی
آگ اپنے کو تو جلا ہی دیتی ہے دوسرے تک اُسکی آگ پہونچے یا نہ پہونچے
اسی طرح ہر شخص کی ذاتی خودغرضی اسی کو زیادہ نقصان پہونچاتی ہے۔ اسلئے
اپنے ہی دل سے خودغرضی کو نکال پھینکنا ہی ہر شخص کا پہلا کام ہونا چاہئیے۔
جو لوگ آپکے گھر میں یا ارد گرد رہتے ہیں وہ خودبخود آپسے آج یا کل سبق آموز
ہوں گے اور اسمیں شک بھی نہیں کہ جو تلقین عمل سے ہوتی ہے وہ خالی زبان سے

نہیں ہو سکتی ۔

اگر والدین اور سرپرست اپنے بچوں کی پرورش اور اُنکی تعلیم و تربیت صرف فرض کے خیال سے یا اس غرض سے نہ کریں کہ اُن کو اُن سے بڑھاپے میں سہارا ہو گا ۔ بلکہ یہ سمجھیں کہ اس پرماتما نے اپنی امانت یعنی ایک معصوم روح اُن کی سپردگی میں دی ہے ۔ اور اُنکو ایک نہایت ہی پاک اور اہم ذمہ داری کی ادائیگی کی توفیق بھی دی ہے ۔ جسکا نہایت مودبانہ اور ذمہ دارانہ اور خوشی کے ساتھ پورا کرنا اُنکا قدرتی حق اور فرض ہے ۔ تو آپ دیکھیں کہ ایسے سرپرستوں کو اسے بیشتر جملہ ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کیا لطف آتا ہے اور کیا سرور آتا ہے ۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی ظاہر ہے کہ محبت اور دوستی بھی وہی پکّی اور دیرپا ہوتی ہے جسمیں کوئی غرض شامل نہ ہو ۔ چاہے ہم کسی سوشل یا ملکی یا مذہبی انجمن کے ممبر ہوں یا اسکے عہدہ دار ہوں یا ہم کسی جمہوریہ کے صدر ہوں یا اُسکے وزیر ہوں یا اُسکے کسی اور ذمہ داری کے عہدہ پر فائز ہوں غرضیکہ جو کوئی بھی ہمارا کام ہو اُسکے ادا کرنے میں ہماری کسی قسم کی خود غرضی شامل نہیں ہے ۔ بلکہ بے لوث خدمت ہمارا مدعا ہے تو یقیناً کامیابی ہو گی ۔ اور ہمارے راستے میں کوئی دشمن انسانیت کا آڑے نہیں ہو سکتی ۔ اور اگر ہمارا قدم ذرا بھی پھسلا اور ایسا تھوڑا بھی ہوا خود غرضی کی تو گویا مصیبتوں اور تکلیفوں اور پریشانیوں کے لئے دریا میں جا گرتے ہیں کوئی تھاہ نہیں اور ڈوب گئے ۔

روزمرّہ کا تجربہ ہے کہ جو تحریر یا تقریر ہم کرتے ہیں اگر ہماری غرض یہ ہے کہ ہماری بس تعریف ہو تو وہ صرف لفظوں کا ایک بیان ہے جس میں اثر نہ ہو

وہ [illegible] میں نہ کوئی جوش ہوتا ہے اور نہ کوئی جذبہ اور پھر اُن کا کوئی اثر بھی نہیں ہوتا - دوسرے اگر ہم کسی کو کھانا کھلاتے ہیں یا دعوت دیتے ہیں، اگر اس میں کوئی غرض شامل نہ ہو اور اپنی امارت اور ظروف کا دکھاوا مدنظر نہ ہو بلکہ بے لوث محبت ہو تو پھر دیکھئے کہ کھانے اور کھلانے والے دونوں ہی کو کیا لطف اور کیا خوشی حاصل ہوتی ہے . قدرت کی طرف بھی آپ نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ سورج چاند، تارے، زمین، ہوا اور پانی وغیرہ وغیرہ اور عمدہ سے عمدہ خوشبو پیدا کرنیوالے پودے اور شیریں پھل دینے والے درخت اور شفا دینے والی جڑی بوٹیاں گویا تمام قدرت بے غرضانہ اور بے عذر اور بلا شکایت و بے چون و چرا اور پھر ہماری اُن کے ساتھ اکثر بدعنوانیوں کے ہوتے ہوئے بھی اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں جسکو پرماتما نے اُن کے سپرد کیا ہے . ہم اینٹ مارتے ہیں اور شجر بدلے میں پھل دیتا ہے .

علاوہ بریں جب انسان مر جاتا ہے اسکا جسم بھی مٹی میں ملجاتا ہے - اسلئے روٹی کپڑا اور روپیہ پیسہ جو اس فانی جسم کو برقرار رکھنے کی اشیاء ہیں وہ بھی بے وجود ہیں - آج ہمارے پاس ہیں اور کل نہیں - اُنکو بھی جسم کی طرح دوام حاصل نہیں . اُن خود کی کوئی قیمت نہیں، بجز اسکے کہ آپ خود ہی اُنکی قیمت جو چاہیں لگا دیں - مگر جنکو دوام حاصل ہے اور جو فنا نہیں ہوتے وہ انسان کی نیکی اور نیک چلنی اور نیک افعال اسکے ایثار اور اسکی قربانیاں اسکا رحم اور اسکا کرم اور اسکی محبت خلق و ملک وغیرہ ہیں - اور دنیا میں سے یہی کوئی ایسا انسان ہوگا جو ان روحانی اور دائمی جوہروں کا طلبگار نہ ہو یعنی جو روٹی پیڑے

اور روپیہ پیسہ پران بڑی خوبیوں کو ترجیح نہ دیتا ہو۔ اسلئے یہ امر مسلّمہ ہے کہ جبتک ہماری نظر اور ہماری زندگی کا مدعا صرف روٹی کپڑا اور پیسہ ہے اسوقت تک ہم نہ حق اور ناحق اور نیکی بدی اور نہ سکھ دکھ کی تمیز کر سکتے ہیں اور نہ پھر ہم خود غرضی سے پاک ہو سکتے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے جو نیک یعنی خدا کی راہ چلتے ہیں اُن کے پاس تو اُنکی ضرورت کے اشیاء خود بخود آجاتے ہیں۔

بہشت کے دروازہ پر ہمارا قدم

میرے بزرگ اور عزیز ناظرین! آپکو یاد ہوگا کہ ہم نے اور آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میرا یہ دعویٰ صحیح نکلا کہ ہماری ذاتی خود غرضی ہی دنیا کے تمام عذابوں اور تکلیفوں کی جڑ ہے جسکی وجہ سے نہ صرف اپنی خود کی بلکہ تمام دنیا کی زندگی مجسم دوزخ بنی ہوئی ہے تو پھر ہم اور کوئی بچہ جوان یا بوڑھا ایسا نہ ہوگا جو اُسکو اپنے دل سے نکال پھینکنے کے لئے بیقرار نہ ہو جائے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں اور آپ بھی خوش ہونگے کہ میرا یہ دعویٰ صحیح ثابت ہوا۔ اور ہم نے اور آپ نے سمجھ لیا اور طے کر لیا کہ ہماری شخصی خود غرضی ہی نے اس دنیا کو دوزخ بنا رکھا ہے۔ اور شخصی خود غرضی ہی اکیلی ہماری اپنی اور ساری دنیا کے جملہ مصائب کی جڑ ہے۔ اور یہ بھی سمجھ لیا اور طے کر لیا کہ وہ مقام اپنا دل ہی ہے جہاں یہ پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم کر لیا کہ یہ بلا کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی خوب سمجھ لی کہ اسکی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک لطیف اور دوسری کثیف۔ اور یہ بھی جان لیا کہ وہ کہاں کہاں

پائی جاتی ہے۔ اور یہ بھی سمجھ لیا کہ "جہل" یعنی گیان کے نہ ہونے سے یہ پیدا ہوتی ہے۔

اسلئے مجھکو یقین ہے کہ جیسے انسان اپنی بات کا پابند ہوتا ہے، کیونکہ اگر وہ اپنی بات کا پابند نہیں ہے تو وہ انسان ہی نہیں ہے۔ آئیے ہم اور آپ اپنے وعدہ کو پورا کریں اور اپنے دلوں سے خود غرضی کو یکلخت نکال دینے کا پکا اور اٹل ارادہ کرلیں۔ بہرکیف کثیف خود غرضی کا دور کرنا کوئی بات نہیں ہے البتہ جو خود غرضی لطیف ہے اور دلوں کے پردوں میں چھپی رہتی ہے وہ ضرور رفتہ رفتہ دور ہوگی۔ صرف سوال جو ہمارے اور آپکے سامنے اسوقت ہے وہ اسے دل میں گانٹھ باندھ لینے کا ہے مصمم ارادہ کرلینے کا ہے۔ اور یہ بھی یاد رکھئے کہ "جو گیا کل وہ گیا ٹل اور جو گیا بھولا وہ گیا پرسوں"۔ ہم ہندوستانیوں کی اور ہماری وجہ سے ہمارے بچوں کی خواہ وہ اسکول میں پڑھتے ہوں یا کالج میں، عام طور پر ہر ایک اچھے سے اچھے اور ضروری سے ضروری کام کو آج سے دوسرے روز پر ٹالنے کی خصلت ہو گئی ہے۔ اسلئے بچوں کو میں خاص طور پر تنبیہ کرتا ہوں کہ انکی تعلیم میں اور زندگی کے جملہ کاموں میں جنہیں اکثر انکو نیچا دیکھنا پڑتا ہے یا خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی، تو اسکی خاص وجہ انکے ٹالنے اور وقت کو ضایع کرنے کی عادت ہے۔ ہم اور آپ اگر پابند ہو جائیں اور وعدہ کریں کہ ہم اپنے جملہ کاموں کے کرنے میں نہ تو گزشتہ کا خیال کریں گے کیونکہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ اور نہ مستقبل کا خیال کریں گے، کیونکہ اسپر ونیز نتیجہ پر ہمارا کوئی قابو نہیں۔ جو کچھ ہم مستقبل کا خیال کر سکتے ہیں،

وہ کچھ گویا اسوقت کا ہم کھو رہے ہیں۔ علاوہ بریں رہنماؤں نے بھی کہا ہے کہ نیک کام کرنے میں کبھی دیر نہ کرو۔ اور یہ بھی کہا ہے کہ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔ اسلئے آئیے ہم اور آپ اس گھڑی اور اسی وقت یہ ٹھان لیں کہ ہم اپنے دل میں خودغرضی کو اب کسیطرح بھی رہنے نہ دیں گے۔ اور یہ سچ ہے اور صحیح ہے کہ جب جہل جاتا ہے تو علم یعنی گیان آتا ہے تاریکی جاتی ہے تو روشنی آتی ہے۔ اسیطرح جس گھڑی ہم نے خودغرضی کو اپنے دل سے نکالدیا، اور خودغرضی سے اپنا دامن چھڑا کر ہم آگے بڑھے تو آپ خود ہی فیصلہ کر لیں کہ کون گیا اور کس کو چھوڑا۔ اسکا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ تاریکی گئی اور ہم نے دوزخ کو چھوڑا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر تاریکی گئی اور ہم دوزخ کے باہر آئے تو کیا چیز آئی اور ہم کہاں پہونچے، اسکا جواب صاف ہے کہ روشنی یعنی گیان آیا اور ہم بہشت میں داخل ہوئے۔ گویا سوئے تھے دوزخ میں اور جاگے بہشت میں۔ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ تنکے کی اوٹ پہاڑ ہے ورنہ کوئی بھی مشکل بات نہیں ہے۔ صرف ارادہ اور مصمم ارادہ کر لینے کا سوال ہے، اور انسان بھی وہی ہے جو سمجھ بوجھ کر جب کسی بات کا ارادہ کر لیتے ہیں تو اسپر قائم رہتے ہیں اور اسکو پورا کرتے ہیں۔ گویا ہم نے اور آپنے یہ طے کر لیا اور ٹھان لیا کہ اسی وقت اس موذی خودغرضی کو اپنے دل سے کوڑے کرکٹ کی طرح نکال ہی پھینکیں گے۔ خصوصاً اپنے عزیز بچوں اور کالج اور اسکول کے طلباء سے میں اصرار کرتا ہوں اور ضرور کہتا ہوں کہ وہ تو یہ ٹھان ہی لیں کہ وہ خودغرضی کو اپنے دل میں، اپنے خیال میں اور اپنے جملہ افعال میں ہرگز ہرگز

نہ آنے دیں گے۔ کوئی مشکل بات نہیں ہے صرف ارادہ کرنے اور ارادہ
پر قائم رہنے کا سوال ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں اور یقین دلاتا ہوں کہ پھر آپ
دیکھیں گے کہ آپ خود کیسے خوش رہتے ہیں۔ اور دوسرے لوگ بھی آپ
سے کیسے خوش رہتے ہیں۔ آپکو ایک نئی، تازہ اور خوشگوار زندگی محسوس
ہوگی اور آپکی تعلیم آپکی آئندہ ترقی اور تمام زندگی اور آپکا سب کچھ اور
آپ خود کمال کو پہونچیں گے جس کے لئے آپ کو قدرت نے انسانی
جامہ دیا ہے۔ اور بزرگوں سے میری استدعا ہے کہ وہ جہاں اپنے
دلوں کو خودغرضی سے پاک کریں وہاں خودغرضی کے بیج کو اپنے بچوں کے
دلوں میں اوائل عمر ہی سے نہ بڑھنے دیں۔

خودغرضی دور کرنے کے عملی طریقے

ایک بچہ بھی جسکو کچھ بوجھ کا مادہ ہے ذرا بھی غور کرنے سے یہ محسوس کر سکتا
ہے کہ اسکے اندر ایک ایسی طاقت ہے جو یہ دیکھتی رہتی ہے کہ وہ کیا محسوس
کر رہا ہے کہ اسوقت دل میں محبت ہے یا نفرت، غصہ ہے یا سکون،
خوشی ہے یا رنج۔ یعنی یہ وہ قوت ہے جو ہمارے خیالات کو دیکھتی رہتی ہے
کہ ہمارا خیال اسوقت کہاں ہے اور کیا سوچ رہا ہے۔ تھوڑی سی مشق
کرنے سے یہ قوت ایک ظاہری قوت صاف صاف معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ
ہر احساس کو محسوس کرتی ہے۔ اور کسی کے احساس میں نہیں آتی۔ اور [illegible]
اسکی مانند یا اس [illegible] احساس کر سکتی ہیں۔ اور جسکا احساس اسکو ہوتا ہے

آیا تو ہم نے اُسکو کس طرح بھگایا۔ اس کام میں دو تین منٹ سے زیادہ صرف نہ ہوگا۔ غرضیکہ آپ جو بھی خیال کریں تو اُسکو دیکھ لیں کہ اسمیں کوئی خودغرضی تو شامل نہیں ہے؟ اور جب خیال پر قابو پالیا تو گفتگو اور افعال پھر اپنے آپ قابو میں آجاتے ہیں۔ اور اُنمیں خودغرضی نہیں رہتی۔

جس عمارت کی بنیاد اچھی اور پختہ پڑتی ہے وُہی قائم رہتی ہے۔ اور اُونچی بھی جاتی ہے۔ اسلئے یہ ضروری ہے کہ ہم اور آپ اپنے خیالات کی دیکھ بھال کے بنیادی پتھر کو خوب سمجھ بوجھکر اور نہایت پختگی کے ساتھ رکھیں۔ کیونکہ اگر پہلی ہی اینٹ ٹیڑھی پڑی تو دیوار پھر سیدھی نہ جائیگی۔ اسلئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ وہ دیکھ بھال کیا ہے۔ اور کیسے ہو۔

اپنے خیالات کی دیکھ بھال اور جانچ کیسے اور کیونکر اور کب ہو؟

اگر ہم اپنے خیالات سے کسی بُرائی کو نکال دیتے ہیں تو پھر وہ بُرائی نہ ہماری گفتگو میں آتی ہے اور نہ کسی اور فعل میں۔ اسیطرح جس بھلائی اور نیکی کا بیج ہم اپنے دلمیں بوتے ہیں تو پھر ہماری گفتگو اور ہمارے افعال دونوں ہی نیک اور خوشگوار ہوتے ہیں۔ اسلئے سارا معاملہ اپنے خیالات ہی کا ہے۔ یعنی جڑ اپنے خیالات ہی ہیں۔ گویا ہم نے یہ ارادہ کرلیا کہ ہم یعنی اپنی قوت تمیز کی سرچ لائٹ کا رُخ اندر کی طرف کریں۔ اور اپنی نظر اندر کی طرف جب ہی ہوگی جب اُسکو باہر کی طرف سے ہٹائیں۔ یعنی

ابتک ہماری نظر کا رُخ باہر کی طرف تھا ۔ اب اندر کی طرف ہوا ۔ بہ الفاظ دیگر ہم ابتک دوسروں کے عیبوں اور برائیوں کو دیکھا کرتے تھے ۔ اب ہم اپنی برائیاں دیکھنے لگے ۔ اور راہِ حق کے رہنمایان نے بھی کہا ہے کہ جب برائیوں پر نظر پڑ جاتی ہے تو دنیا میں کوئی اور برا نہیں دکھائی دیتا ۔ اور بات بھی ٹھیک ہے کہ ایک راجہ کو اپنے راج کی دیکھ بھال ہیں کہ ہماری رعیت دکھی ہے یا سکھی اور ایک کسان کو اپنے لہلہاتے ہوئے کھیتوں اور باغوں کی دیکھ بھال میں جو لطف آتا ہے اور جو سرور آتا ہے وہ کہیں اور نہیں آتا ۔ بلکہ اسکا پہلا فرض ہے کہ اپنے کھیتوں اور باغوں کو گھاس وغیرہ سے صاف کرتا رہے ۔ اور اسکی ہر طرح سے حفاظت کرتا رہے تاکہ وہ خوب پھولے اور پھلے ۔ علاوہ بریں جو سکھ ہمکو گھر میں ملتا ہے وہ کہیں دوسری جگہ نہیں ملتا ۔ جو مزہ ہمکو اپنی ماں ، اپنی بیوی اور اپنی بہن اور اپنی لڑکی کے اور اپنے بنائے ہوئے کھانے میں آتا ہے وہ باہر کے کسی کھانے میں نہیں آتا ۔ یہ بات قدرتی ہے ۔ اسلئے جو آنند اور جو کیف اور جو نہیں اپنا فائدہ بھی متصور ہے اپنے اندر کی طرف نظر ڈالنے میں آتا ہے وہ باہر کی طرف ڈالنے میں نہیں آسکتا ۔ یہ بات بھی قدرتی ہے ۔ کاش کہ جرمنی ، فرانس ، انگلینڈ ، اور روس اور امریکہ اور جاپان اور تمام ملکوں کی تحقیقات اور انکی سائنس کا رُخ دوسروں کو مارنے کی ایجادوں اور ترکیبوں کے بجائے اگر اپنے خود یعنی اپنے نفس کو مارنے اور اپنے اندر کی تحقیقات کی طرف ہوتا تو دنیا سے جنگ ہی اُٹھ جاتی ۔ کیونکہ موجودہ دنیا کی تہذیب اور تمدن کا ٹھیکہ انہیں کے ہاتھوں میں اور انھیں کی بادشاہت تمام دنیا میں ہے ۔ اگر وہ خود کو مارتے تو خود بھی سونا بنجاتے

نہ کریں۔ یہ بات قدرتی ہے کہ اگر ہم کسی کے ساتھ بُرائی کرتے ہیں تو کوئی
دوسرا بھی ہمارے ساتھ بُرائی کریگا۔ دوسرے جب خوف بدلہ اور نفرت
کے خیالات ہمارے دلوں میں نہ رہیں گے تو ہم ایسے خیالات کو دوسری
جگہ سے کشش بھی نہ کریں گے۔ یعنی کوئی دنیوی طاقت ہم سے نہ نفرت
کر سکتی ہے اور نہ ہم سے کوئی بُرا برتاؤ کر سکتی ہے۔ اور واقعہ ہے کہ اس
اصول کا عملی ثبوت بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور وہ اپنی زندگی
ہی میں ہمکو ملا ہے۔ اور جو روز روشن کی طرح صاف صاف نظر آ رہا ہے۔
اور چمک رہا ہے کہ سنہ ۱۹۲۱ء کی عدم تشدد کی تحریک کے بعد جس قدر
تشدد ہمارے افعال اور ہماری گفتگو اور ہمارے خیالات سے نکل گیا ہے
اور جس قدر بھی ہمارے دل سچے اور پاک ہو گئے ہیں اتنی ہی اور اسی کے
قدم بہ قدم ہم سیاسی ترقی بھی کرتے گئے ہیں۔ اور اتنی ہی زیادہ ہماری وقعت
نہ صرف برطانیہ کی نگاہوں میں، بلکہ چین، امریکہ اور تمام دنیا کی نگاہوں میں
دن بدن بڑھتی گئی ہے اور بڑھتی جاتی ہے۔ کیونکہ جب ہمارے دل میں تشدد
ہی نہ رہا تو خود غرضی کہاں رہی۔ ان وجوہات کے اثر بنا پر آج اور اس
گھڑی اور اسوقت ہم نے یہ ٹھانا ہے اور مضبوط ارادہ کر لیا ہے کہ ہم اپنے
اندر کی طرف رخ کریں۔ اور اپنے خیالات کی دیکھ بھال بغیر رکے بغیر رعایت
کے کیا کریں۔ تاکہ خود غرضی کے خیالات کو جو حملہ کرنے کو چھپے ہیں اپنے دل میں
نہ آنے دیں۔ اور جب ہمارا دل خود غرضی سے پاک ہو گا تو ہمارے تمام افعال
بھی خود غرضی سے پاک ہونگے۔

مجھے یقین ہے کہ ہر سمجھ رکھنے والا بچہ تک بھی جو اس کتاب کو پڑھ
سکتا ہے وہ میری گفتگو کو بخوبی سمجھ رہا ہے اور میرے ساتھ چل
رہا ہے۔ ہم یہ بھی طے کر چکے ہیں کہ خود غرضی جہل سے پیدا ہوتی ہے۔ اسلئے
ظاہر ہے کہ جہل کو اپنے خیالات سے دور کر دینے سے خود غرضی بھی دور
ہو جاتی ہے۔ اور جہل جب ہی دور ہوگا جب ہمیں گیان آئیگا۔ اور گیان
کی تعریف ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ جسکی بنا پر ہمکو یہ دیکھنا چاہیئے کہ (۱)
ہم کسی کے ساتھ بدی نہ کریں بلکہ نیکی کریں (۲) کسی کو دکھ نہ دیں بلکہ اسکو
سکھ پہونچائیں (۳) کسی کا حق نہ لیں بلکہ جسکا حق ہے اسکو دیں۔
صرف ہم کسی کے ساتھ بدی نہ کریں (۲) کسی کو دکھ نہ دیں، اور (۳)
کسی کا حق نہ لیں تو اس حالت میں بھی ہم کیا سے کیا ہو جاتے ہیں۔ اور ہم دنیا
کے لئے اور دنیا ہمارے لئے کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ اور پھر ساتھ ہی ساتھ
دنیا بھی کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہم ایک قدم اور آگے بڑھیں یعنی اُن انسانی
فرائض کو بھی پورا کریں جنکی قدرت ہمکو تلقین کرتی ہے، یعنی ہم (۱) سب کے
ساتھ نیکی کریں (۲) سب کو سکھ پہونچائیں اور (۳) جسکا جو حق ہے اُسکو
دیں تو اس حالت میں گویا ہم نے علم یعنی گیان کے صحیح معنوں اور اس کے
مدعا کو سمجھا، اور ہم اور ہماری زندگی دونوں بلکہ ہمارے ساتھ دنیا بھی جنت
بن گئی۔ اسلئے اپنے خیالات کی جانچ و پڑتال سے غرض یہ ہے کہ ہم اپنے
دلمیں وہ جذبات و خیالات نہ آنے دیں جو (۱) دوسروں کے ساتھ بدی کرنے
(۲) دکھ پہونچانے اور (۳) کسی کے حق چھیننے کے ہیں۔ اور نہایت سختی اد

ہوشیاری کے ساتھ اپنے دل کا اس بارہ میں پہرہ رکھیں بلکہ ان جذبات اور خیالات کے بجائے (۱) دوسروں کے ساتھ نیکی کرنے (۲) دوسروں کو سکھ پہونچانے اور (۳) جو جسکا حق ہے اسکو دینے کے خیالات کو اپنے دل میں جگہ دیں۔ اور انکو مستحکم کریں۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس بات کی بھی کوشش کریں کہ (۱) دوسروں کے ساتھ نیکی کرنے، انکو سکھ پہونچانے اور جو جسکا حق ہے اسکو دینے کے خیال اور فعل دونوں میں کوئی خودی، خود غرضی اور خودستائی (یعنی اپنی تعریف ہونا) خود نمائی یعنی دکھلاوا اور غرور وغیرہ شامل نہ ہوں۔

جیسے ۲ دو اور ۲ دو ملکر ۴ چار ہوتے ہیں ۳ تین یا ۵ پانچ یا ۶ چھ نہیں ہوتے اسیطرح اس قول کو اپنے دل پر نقش کر لینا چاہیئے کہ انسان چاہے کتنی ہی کیوں نہ خواہش اور کوشش کرے کہ دنیا رہ راست پر اور راہ حق پر آجائے، مگر دنیا رہ راست اور رہ حق پر اسوقت تک نہ آسکے گی جب تک کہ وہ انسان خود اپنے آپکو درست نہیں کرتا۔ اور خود بھی رہ راست اور راہ حق پر نہیں آتا۔ اسلئے آئیے ہم اور آپ دونوں پہلے اپنے دلوں اور اپنے خیالات کو خود غرضی سے پاک کریں یعنی اپنے دل میں کسی بھی خود غرضی کے خیال تک کو مندرجہ بالا طریقوں پر ہوشیار اور سختی کے ساتھ کاربند ہو کر آنے ہی نہ دیں۔

خودغرضی نہ رہی تو انسان کن کن کمالات کو پہونچتا ہے؟

جس طرح سردی کی ضد گرمی ہے۔ بدی کی نیکی، تاریکی کی روشنی اور رنج کی خوشی اسی طرح خودغرضی کی ضد پریم یعنی محبت ہے۔ جس لمحہ یعنی جس گھڑی خودغرضی ہمارے دل سے نکلی تو پریم اسکی جگہ پر قدرتی طور پیدا ہو جاتا ہے۔ ہمارے دل میں صرف انسانوں کے لئے بلکہ جملہ جانداروں کیلئے اور تمام قدرت کیلئے پریم پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اور لوگ اور تمام خلقت بھی ہمارے ساتھ پریم کرنے لگتی ہے۔ اور یہی اس بات کی پہچان ہے کہ خودغرضی ہمارے دل سے گئی۔

(۲) جس وقت خودغرضی ہمارے دل سے نکل جاتی ہے تو ہمارا اندر اونچا ہو جاتا ہے۔ جب ہم اپنے اندر کی طرف نگاہ کرنے لگتے ہیں تو ہمکو اپنی آنکھ کے اندر کا شہتیر نظر آنے لگتا ہے۔ پھر دوسروں کی آنکھ کا تنکا ہمکو دکھائی نہیں دیتا۔

(۳) جب خودغرضی اور اسکی بہنیں ہمارے دل سے رخصت ہو جاتی ہیں تو ہمارا دل غصہ، خوف، کینہ، بدکاری، ناپاکی، بغض، حسد، تلون مزاجی، نفرت، فکر، شک و شبہ، رنج اور مایوسی سے آزاد ہو جاتا ہے۔

(۴) جب خودغرضی نہ رہی تو انسان اپنے جملہ افعال و کارہائے منصبی

کو نہایت احتیاط اور توجہ، شفقت اور محبت کے ساتھ کرتا ہے۔ فرض
کو فرض سمجھ کر اور دھرم سمجھ کے ساتھ کرنے کے شعور کو حاصل کرتا ہے۔ وہ
کسی عہد یا ذمہ داری کے از خود حاصل کر لینے کے چکر اور اس کے بکھیڑے سے
آزاد ہو جاتا ہے۔

(۵) جب خود غرضی دور ہوتی ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ روٹی اور کپڑا انسان
کی زندگی کے مقصد نہیں ہیں۔ بلکہ ان دونوں کو وہ اپنے پیدا کرنے والے
پر چھوڑ دیتا ہے۔ اور حلال اقتصادیات سے آزاد ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ دیکھتا
ہے کہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر کی سبزیوں اور درختوں کو کون پانی دیتا ہے؟
پھر وہ قائم نہ رہنے والی اشیاء کی طرف دوڑتا اور بھاگتا نہیں۔ وہ
سمجھتا ہے کہ جن کو فنا ہے اور جن سے دوامی روح کو سرور ابدی اور
منزل مقصود کا اکتساب حاصل ہوتا ہے وہ سچائی ہے۔ نیکی ہے،
ایثار ہے، دیا ہے، پریم ہے اور شانتی ہے۔ اور پھر وہ انھیں کو
اپنی زندگی کا مقصد بناتا ہے۔ وہ ضروریات اور خواہشات میں تمیز
کرتا ہے۔ اپنی عادات اور اپنی زندگی کے اقوال کا مطالعہ، دیکھ بھال
اور پڑتال کرتا ہے۔ نامناسب عادتوں اور نامناسب صحبتوں سے کنارہ کش
ہو جاتا ہے۔ اپنے کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، کام کرنے اور سونے
میں احتیاط رکھتا ہے۔ اور اعتدال کو برتتا ہے اور وقت کی اور
اپنی بات کی پوری پوری پابندی کرتا ہے۔ غرضیکہ وہ اپنے جسم اور اپنے
خیالات اور اپنے جذبات اور خواہشات کو اپنے قابو میں کر لیتا ہے۔

اور انہیر حکومت کرتا ہے ۔ اور جو اُسکا اس جسم کے خود مالک ہوتے ہوئے فرض اتولین بھی ہے ۔ اور واقعہ ہے کہ جس نے اپنے من کو جیت لیا اُس نے جگ کو جیت لیا جس نے اپنے دل پر فتح پائی اُسکے ہاتھ دنیا کی بادشاہت آئی ۔ اور اسی نے پوری پوری آزادی حاصل کی ۔ کیونکہ آزادی کے نہ ہونے کے ہی معنی دُکھ کے ہیں ۔ اور واقعہ ہے کہ انسان کا دل ہی اُس کا سب سے بڑا دشمن ہے اور سب سے بڑا دوست ہے ۔ وہی سکو دُکھ میں ڈالتا ہے اور وہی دُکھ سے نجات بھی دلواتا ہے ۔ جیسے ہوا ہی سے چراغ جلتا ہے اور ہوا ہی اُسکو بجھاتی بھی ہے ۔ ہوا ہی بادوں کو لاتی ہے اور ہوا ہی بادوں کو منتشر کر دیتی ہے ۔

(۶۱) جب انسان کے دل سے خودی ، خودنمائی اور خودستائی نکل جاتی ہے تو وہ خوش اعتقاد ہو جاتا ہے ۔ اور جو کبھی درپیش آتا ہے اُسمیں خوش رہتا ہے ۔ اور راضی رہتا ہے اسکی رضا میں ۔ وہ بے خوف ہو جاتا ہے ۔ اور اپنے خیالات کے اظہار میں اُسکو آزادی نصیب ہوتی ہے ۔ اُسکو یہ ضرورت باقی نہیں رہتی اور نہ اُسکو یہ تمنا ہوتی ہے کہ لوگ اُسکی تعریف کریں یا اُسکی رائے کی ضروری قدر کریں یا اُسکو اچھا سمجھیں وہ نہ اپنی رائے کو دوسروں کے سر منڈھتا ہے نہ اُن لوگوں کی رائے کی ہنسی اُڑاتا ہے جو اس سے مختلف رائے رکھتے ہیں ۔ نہ اُن پر رائے زنی کرتا ہے اور نہ اپنی رائے یا بات کی زبردستی حمایت ہی کرتا ہے ۔ اور نہ کبھی وہ اِتراتا ہے اور نہ کسی کی شکایت کرتا ہے ۔ اور نہ اسکے دلمیں

عیوض یا بدلہ لینے کا خیال ہی پیدا ہوتا ہے۔ اور نہ وہ اپنی شہرت اور
نیکنامی چاہتا ہے۔ وہ اپنے خیال تک میں کسی سے مزاحمت یا مقابلہ نہیں
کرتا۔ اور مزاحمت نہ کرنے کی وجہ سے اُنپر غالب آتا ہے۔ اور اپنی ہار کو اُلٹکر
ایک جلیل القدر فتح حاصل کرتا ہے۔ اور مخالفت اور مطابقت کرنے والے
دونوں ہی لوگوں سے نرمی اور شیریں زبانی سے پیش آتا ہے۔ اور ہر کس و
ناکس کے ساتھ صلح و آشتی کا برتاؤ کرتا ہے۔ اور جو لوگ اُس سے بدی کرتے
ہیں اُن کے ساتھ نیکی کرتا ہے۔ مان اپمان، دُکھ سُکھ، دوستی اور دشمنی
خوشی اور رنج اور سردی اور گرمی کے خیال سے آزاد ہو جاتا ہے۔

(٧) جب انسان کے دل میں خودغرضی باقی نہیں رہتی تو اُسکے دل میں
دوسروں سے ہمدردی، دیا، رحم اور پریم پیدا ہوتے ہیں اور جو سب ایک ہی
چشمے کے سوتے ہیں۔ اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ جو دُوسروں کی تکلیف
ہمکو ہوتی ہے خواہ وہ بخار کی ہو یا اپریشن کی، اگر ہم اُسی تکلیف میں دوسرے
کو دیکھتے ہیں تو ہمکو اُسی اپنی تکلیف کا احساس ہو جاتا ہے۔ اور اُسی کی یاد
آجاتی ہے۔ اور ہمکو اُس شخص سے دیا، ہمدردی اور پریم پیدا ہو جاتا ہے۔
اسیطرح جب ہمارے دل سے خودغرضی نکل گئی تو دوسروں کو خودغرضی
میں ڈوبا ہوا دیکھکر ہمکو اُن پر دیا آتی ہے۔ غصّہ نہیں آتا۔ اگر ہم سے
چھوٹا بھی ہماری توہین کر دے تو ہم خاموش ہو جاتے ہیں۔ اور سوچنے
لگتے ہیں کہ اسمیں تو ہمارا ہی قصور ہے کہ ہم نے اسکو اسقدر کیوں سر چڑھایا
یا ایسا موقع ہی کیوں آنے دیا جو ہماری توہین ہوئی۔ اگر کوئی شخص ہم سے

ناراض ہو جاتا ہے تو ہم چپ چپ رہتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہم خود اسبارہ میں
کسقدر اور کہانتک قصوروار نہیں۔ اور پھر ہم آپ سے اپنی غلطی کی معافی مانگتے
ہیں۔ جس انسان کا دل خود غرضی سے پاک اور صاف ہے تو وہ کسی پر
ناراض نہیں ہوتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ جسکا جو جوہر ہے یا جسکی جو عادت ہے
وہ اس سے باز نہیں آسکتا۔ وہ جانتا ہے کہ سانپ اپنے ڈسنے اور بچھو
اپنے ڈنک مارنے اور شیر اپنی درندگی کی اصلی عادت کو چھوڑ نہیں سکتے
اسیطرح جس انسان کی جو بھی عادت پختہ ہوگی وہ اس سے
باز نہیں آسکتا۔ اسلئے جسکی عادت جھوٹ بولنے یا چغلخوری وغیرہ کی
پڑ گئی ہے تو وہ اس سے ناراض نہیں ہوتا۔ بلکہ اس سے ہمدردی کرتا
ہے اور نہایت پریم سے اسکو ہدایت کرتا ہے۔ اور اگر اسکی ہدایت بیکار
ثابت ہوتی ہے تو بھی وہ ناراض نہیں ہوتا۔ بلکہ خیال کرتا ہے کہ اسکی
زبان میں ابھی اثر نہیں ہے۔ اور اسکے دل میں ابھی طاقت کم ہے۔ اگر
اسکے چاروں طرف گھر میں اور باہر خود غرض ہی لوگوں کو پاتا ہے تو وہ گھبراتا
نہیں اور نہ افسوس کرتا ہے اور نہ ناراض ہوتا ہے بلکہ خوش ہوتا ہے
کہ یہ سب اسکی آزمائش کے لئے اور اسکو پختہ بنانے کے لئے [illegible]
گھیرے [illegible] گئے ہیں۔ اگر وہ مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ
مشیت ایزدی یہی تھی۔ وہ سمجھتا ہے کہ [illegible] صاف ہونے کے لئے پایا تھا
[illegible] اور وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ جو کچھ بھی اس دنیا میں مصیبت آتی ہے
وہ اسکی بہبودی کی صورت ہوتی ہے۔ خدا کی رحمت اسمیں چھپی رہتی ہے

اپنے ملک اور دنیا کیلئے جیتا ہے۔ اور اس کیف میں وہ ساکت
شانت اور خوش رہا کرتا ہے۔ اور واقعہ ہے کہ خود غرضی
سے عظیم تر دنیا میں اور کون کمال ہے؟ وہ انسان کو سب سے
اونچی چوٹی پر بٹھال دیتی ہے۔ اور رہنمایان حق نے کہا ہے کہ
جب خودی کا پردہ اٹھ جاتا ہے تب ہی خدا ملتا ہے۔ اور جب
"میں" جاتی رہی تو "تو ہی تو" باقی رہا۔ اور جب وہ خود اوپر اٹھتا
ہے تو دنیا کو بھی اپنے ساتھ اوپر اٹھاتا ہے۔ خود آزاد ہوتا ہے
اور دنیا کو بھی آزاد کرتا ہے۔ اور یہی اسکے خیال۔ اسکے دل
اور اسکے افعال کا کھانا پینا اور اٹھنا بیٹھنا ہو جاتا ہے جس کام
کیلئے کہ وہ دنیا میں آیا ہے۔

بچوں میں خود غرضی یا کسی عادت کے دور کرنے اور انکے اخلاق کو سدھارنے پر کچھ ضروری باتیں

ہم نے اور آپنے نہایت توجہ غور اور فکر کے ساتھ سمجھ لیا
اور طے کر لیا کہ خود غرضی کو دل سے نکالدینے کے لئے اپنے خیالات
کی دیکھ بھال کیا اور کیسے کیجائے۔ اور یہ بھی سمجھ لیا کہ وہ کون کون سے
شیریں پھل ہیں اور کون کون سی دوامی خوبیاں اور جوہر ہیں جو
خود غرضی سے دور ہونے سے ہمکو ملتے ہیں۔ اور جنکو حاصل کرنا ہماری

زندگی کا قدرتی مقصد ہے ۔ اور ہمکو کوئی شئے اُسیوقت حاصل ہوتی ہے ۔ جبکہ ہماری کمال توجہ اور ہمارا پورا یکسوئی کے ساتھ دھیان اُس طرف ہو جاتا ہے ، اور ہمارا دھیان اُس طرف جب ہی ہوگا جبکہ ہمکو اسکی یاد ہر وقت تازہ رہے ۔ اور ہمکو یاد کسی شئے کی جب ہی رہتی ہے جبکہ ہم اسکا ورد یعنی جاپ کرتے رہیں ۔ اور جاپ کے معنی کسی بات یا کتاب کو سمجھ بوجھکر بار بار پڑھنے کے ہیں ۔ اسلئے ضروری ہے کہ ہم اور آپ ان اصولوں کو جنکو اس کتاب میں طے کر لیا ہے ۔ انکا روزانہ مطالعہ کریں اور اُن پر غور کریں اور اپنی ترقی اور تنزلی دونوں کو ایک کاپی پر روزانہ لکھتے جائیں اور آگے قدم بڑھاتے جائیں ۔ قابل غور ہے کہ ناپائدار جسم کو کھانا کھلانے اور کپڑا پہنانے کے لئے ہم کیا کیا نہیں کرتے ۔ پڑھتے ہیں ، لکھتے ہیں ، کاروبار کرتے ہیں اور سب ہی کچھ کرتے ہیں تو پھر ان دوامی خوبیوں اور جوہروں کے اکتساب کے لئے جو ہماری زندگی کے اصل مقصد ہیں ہمکو کچھ نہ کچھ ہاتھ پیر ہلانا تو ضروری ہے اور کچھ تدابیر اور کچھ طریقوں کو اختیار کرنا لازمی ہے ۔ حالانکہ صرف تنکے کی اوٹ پہاڑ کا مسئلہ ہے ۔

کیسی ہنسی کی بات ہے کہ ہمارے اکثر والدین اور آجکل کے کرایہ کے اُستاد چاہتے ہیں کہ بچوں کی عادتیں اُنکی طبیعتیں اور سنسکار ایک چھو منتر سے بدل جائیں صرف زبانی جمع خرچ سے لڑکے جھوٹ بولنا چھوڑ دیں ۔ یا بلا اجازت کسی کی کوئی چیز لینے کی عادت کو ترک کر دیں یا خود غرضی کو دل سے نکالدیں ۔ واقعہ تو یہ ہے کہ والدین کو اتنی فرصت ہی نہیں اور پھر

پھر کیا یہ ملک کے اُستادوں اور تیسرے غیر ملکی اُستادوں کو اسکی حاجت ہی کیا اور اُنکو یہ ضرورت ہی کیوں محسوس ہو اور اس بات کا اُنکو خیال ہی کیوں آئے کہ وہ یہ تو دیکھیں کہ ہمارا بچہ یا ایک مدرسہ کا لڑکا کہاں جاتا ہے کیا کرتا ہے۔ اور کیا ہو رہا ہے۔ اور یہ تو بڑی بات ہے جو انکو یہ فکر ہو کہ اس بچے یا لڑکے کے خیالات کیا ہیں، اسکا رجحان کیا ہے اور وہ کیا سوچا کرتا ہے اور وہ کن طرائق پر درست راہ پر آسانی سے آسکتا ہے اسکے اندر کیا کیا خوبیاں ہیں۔ اور انکو کیسے اُبھارا جا سکتا ہے تاکہ اسکی خوبیاں اپنے کمال کو پہونچیں اور اس لڑکے میں کیا ہونے کے کیا آثار ہیں جن آثاروں کو اُبھارنے، انکو تربیت دینے سے وہ اپنے مزاج کے موافق کاموں میں اعلیٰ سے اعلیٰ اور بہتر سے بہتر درجہ کو پہونچ سکتا ہے

ظاہر ہے کہ کون ایسا باپ ہے جو یہ نہ چاہتا ہو کہ میرا بیٹا اچھا ہو۔ مگر چاہنے ہی سے وہ اچھا نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ جھوٹ نہ بولے تو ہم بھی تو جھوٹ بولنا چھوڑ دیں۔ اور اس سے جھوٹ نہ بلوائیں کہ گھر میں ہم موجود ہیں اور کسی شخص سے اگر ملنا نہیں چاہتے تو اکثر اپنے بچوں ہی سے کہتے ہیں یا نوکروں سے بچوں کے سامنے کہہ دیتے ہیں کہ "کہہ دو گھر میں نہیں ہیں" اگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ پرائی چیز نہ لے تو ہم بھی پرائی چیز بلا اجازت کے نہ لیں۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ کا تذکرہ کرتا ہوں:- لکھنؤ میں ایک ہندوستانی جج صاحب جو انصاف کے لئے دور دور مشہور تھے انکو میں نے دیکھا کہ صبح کی سیر کے موقع پر

راستہ میں کسی کے باغ سے وہ چند پھول توڑ کر لئے چلے آرہے ہیں۔ اور فخریہ سونگھتے انکو گھر لئے جا رہے ہیں اور جو ان کے بچوں کے ہاتھ میں ضرور کچل پڑیں گے۔ میں نے غور کیا کہ ایک معنی میں یہ تو چوری ہے۔ کیونکہ انھوں نے مالک باغ کی اجازت کے بغیر ان پھولوں کو توڑا ہے۔ اس خیال کے دل میں پیدا ہونے کے بعد جو دیکھا تو بہت سے ملکی بھائی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور وکلاء اور حکام وغیرہ بھی اس جرم کے مرتکب ہیں۔ شاید بڑوں کے لئے یہ چھوٹی سی بات کچھ بھی نہ ہو، مگر بچوں کے لئے تو یہ بد گاری ہی ہے۔ چلتے پھرتے اکثر ہمارے بچے سڑک پر پڑی چیزیں مثلاً کاغذ اور پھول وغیرہ بھی اٹھا لیتے ہیں۔ مگر ہم انکو نہیں سمجھاتے کہ ہمکو ان کے اٹھانے کا کیا حق ہے اور کیا ضرورت ہے۔ یہ تو پرائی ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جبر اور سختی سے کام نہ لیں۔ بلکہ جیسے کسی بیماری کا علاج دھیرے دھیرے صبر و توجہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی طرح کسی نامناسب عادت کو چھڑانے کے لئے صبر و تحمل اور موقع محل سے کام لیں۔ بے موقع کی بات بھی بیکار جاتی ہے۔ جب میں کالج میں پڑھتا تھا مجھکو اپنے ایک رشتہ دار کو ایک مشورہ دینے کیلئے مہینوں کا انتظار کرنا پڑا تھا۔ اگر میں نے درمیان میں اس بات کا انکو نشان و گمان بھی دیا ہوتا تو یقینی تھا کہ وہ میرے اوپر الٹ ہی پڑتے۔ اسلئے موقع محل کا خیال بھی اشد ضروری ہے جسکی اہمیت ذرا غور کرنے سے معلوم ہوگی۔ موقع سے میرا مطلب اس موقعہ کا ہے جبکہ بات دل میں چبھ جائے۔ یہ بھی قابل توجہ ہے کہ ایک ان پڑھ سپہر اکثر

کس ہوشیاری سے اور بین سے مست کر کے ایک سانپ کو کھلاتا ہے اور اپنے قابو میں لاتا ہے۔ مگر ہمارے ملک کے بڑے بڑے عالم اور فاضل والدین اور پروفیسر اور پرنسپل صاحبان اکثر بچوں کی اُس معصوم روح سے جو دنیا بھر کی طاقتوں میں سب سے بڑی اور پاک طاقت ہے گویا کھیلا کرتے ہیں اسکو ظالمانہ اور بیرحمانہ اور قاتلانہ کچل کر اور مار کر رہ راست پر لانا چاہتے ہیں۔ یہ تو ویسی ہی بات ہے کہ ایک ناعاقبت اندیش ماں اپنے بچہ کو افیون کھلا کر سلا دیتی ہے اور اپنی ذمہ داری سے بچا کرتی ہے۔ قابل توجہ ہے کہ ان پروفیسران تک کو اگر یہ حکم دیا جائے کہ ۵ منٹ تک اپنی کرسی سے نہ اُٹھیں اور اپنے کمرہ سے باہر نہ جائیں تو پھر دیکھئے کہ یہ باہر ہی جانے کو کیسے اور کتنے بے چین اور پریشان ہو جاتے ہیں۔ یہ قدرتی بات ہے۔ کسی بچہ یا جوان یا بوڑھے کو کسی بات کو کرنے سے منع کیا جائے تو وہ اور دا کر اُسکو بار بار کرتا ہے۔ اور اگر سختی کیجائے تو اور زور پکڑتا ہے۔ حکم تو جب ہی حکم ہے جب اپنا دل بھی اسکو حکم سمجھے۔ اور کسی کا دل کسی کام کرنے کو جب ہی حکم دیگا جب آپ اُسکے دل کو اپنے ہاتھ میں لیں گے۔ اور دل سختی اور جبر سے ہرگز ہرگز ہاتھ میں نہیں لیا جا سکتا۔

علاوہ ازیں ہم ہندوستانیوں میں یہ تو عام طریقہ رہا ہے بلکہ رواج سا ہو گیا تھا اور اب بھی بہت کچھ ہے کہ باپ اور بڑے اپنے بچوں کیلئے اُن کے دلوں کو زخمی کر دینے والے، روح کو افسردہ کرنے والے اور دماغ کو پریشان کرنے والے الفاظ عام طور پر بسا اوقات لاڈ میں بھی استعمال کیا

کرتے ہیں کہ لڑکا نالائق ہے ۔ بے شعور ہے ، شریر ہے ، شیطان ہے ، بیوقوف ہے ۔ نہ لکھتا ہے نہ پڑھتا ہے فیل ہو جائیگا گھاس کھودیگا ۔ وغیرہ وغیرہ " اور آئے دن آئے گئے سے اس دکھڑے کا رونا گویا ایک اپنے فرض کی ادائیگی اور اپنے قلب کے اطمینان کا وسیلہ سمجھتے ہیں ۔ چاہے یہ سب باتیں اس لڑکے میں نہ بھی ہوں ۔ اول اگر یہ باتیں کسی بچہ میں واقعتاً ہیں بھی تو یہ زیادہ تر والدین کی لاپرواہی کی وجہ سے ہیں ۔ دوسرے ان لفظوں کے ہر وقت رٹنے اور ہر کس و ناکس کے سامنے دہرانے سے بچوں کے دل زخمی ہوتے ہیں اور وہ زیادہ ڈھیٹ اور گستاخ ہو جاتے ہیں ۔ اور انکی یہ عادتیں اور زیادہ پختہ ہو جاتی ہیں ۔ یہ بچے غمگین اور پژمردہ رہتے ہیں اور بزدل بھی ہو جاتے ہیں جو سب باتیں انکی تندرستی پر بھی نہایت خراب اثر ڈالتی ہیں ۔ اور اگر یہ باتیں اس لڑکے میں موجود نہیں ہیں تو باپ کے انکو ہر وقت برا بھلا کہنے سے آخر میں وہ لڑکا سنتے سنتے ویسا ہی ہو جاتا ہے ۔ ٹھیک جیسے ایک ایماندار ملازم بھی بلاوجہ اور متواتر شک کئے جانے پر آخرکار بے ایمان بنجاتا ہے ۔ اور ایسی بھی مثالیں موجود ہیں جہاں ایک باپ یا تو اپنے غصّہ کے اظہار میں یا اپنی شان میں گھر کے کسی بڑے یا چھوٹے کے ذریعہ حتیٰ کہ نوکروں تک کے توسط سے ، اپنے لڑکوں کو تنبیہ یا ہدایتیں تحکمانہ دیا کرتے ہیں ۔ جسکو لڑکے برا مانتے ہیں ۔ بددل ۔ بے پرواہ اور بے ترخ اور اکثر گستاخ ہو جاتے ہیں ۔ بگڑ بھی جاتے ہیں ۔ بداطوار اور بدچلن بھی ہو جاتے ہیں ۔ وقت یہ ہے اور افسوس بھی ہے کہ ہم قطعی بھول جاتے ہیں

کہ جب ہماری خود کی ان بچوں کی عمر تھی تو ہم کیا تھے ۔ اور کیا کیا کرتے تھے ۔
اور اسلئے ہم اپنے بچوں سے ایسی سمجھ بوجھ بردباری اور شایستگی وغیرہ باتوں کے
متوقع ہوتے ہیں جنکی ہم کو آپ سے اور اپنی عمر والوں سے توقع ہے ۔ ہم یہ بھی
بھول جاتے ہیں کہ بچوں کے بھی دل ہے ۔ بچوں کے دلوں میں بھی گرمی ہے ۔ انکو
بھی اپنی عزت اپنے وقار اور اپنی خودداری اور اپنی حیثیت کا پاس ہے ۔ اور
یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ بچوں کے ان قدرتی جوہروں پر آب آجانا ایک گناہ عظیم
ہے ۔ اور انکو نکما اور ناکارہ بنا دینا ہے ۔

مجھکو معلوم ہے اور جو بات انکے اور انکے بچوں کی اور ہماری اور ہمارے
ملک کی بدبختی اور پستی کا باعث ہے کہ اکثر بھلے گھر کے بھی ماں باپ اپنے بچوں
اور بچیوں تک کو گالیوں کے الفاظ سے بھی مخاطب کرتے ہیں ۔ اور گالیاں دیتے
بھی ہیں ۔ جسکے ہیبت ناک نتائج پر خاموشی ہی اختیار کرنا مناسب سمجھتا ہوں
مندرجہ بالا باتوں کے برعکس میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اگر بچوں کو اوائل عمری
ہی سے مناسب تربیت دیا جائے ۔ دوسروں کے سامنے ان کا ذاتی احترام
کیا جائے ۔ ان کے واسطے اچھے الفاظ استعمال کئے جائیں ۔ انکو اچھا کہا جائے
چاہے وہ پورے طور پر اچھے نہ بھی ہوں ۔ صرف مصلحتاً کہا جائے ۔ انکو یقین دلایا
جائے کہ ناواجب باتوں کا چھوڑنا اور اچھی عادتوں کا ڈالنا بالکل ہی آسان
ہے ۔ صرف تمہاری توجہ اور ارادہ کرنے کی ضرورت ہے ۔ اور ان کو وقتاً
فوقتاً اپنے بزرگوں کے باکمال سچے ، مخیر ، شجاع اور حکمران ہونے کے کارنامو
کی اور اپنے خاندان اور قوم اور ملک کے لئے جلیل ان کے ایثار اور قربانیوں کی

شدھ دلائی جائے۔ اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کے لئے اُنکو اُبھارا جائے
اور اُن کے چھوٹے چھوٹے بھی اچھے اور نیک کاموں اور اُن کے نیک
اطوار کو اکیلے میں اور دوسروں کے سامنے بھی ایک حد تک سراہا جائے
تو بچے نہایت فرماں بردار، نیک اطوار، پڑھنے لکھنے میں متوجہ اور نیز اور
شیر دل بنجاتے ہیں۔ ہمیشہ خوش رہتے ہیں جس سے اُنکی تندرستی بھی اچھی
رہتی ہے۔ اور پھر وہ اپنے والدین یا سرپرست کا احترام اور خدمت بڑے
پریم کے ساتھ تازیست کیا کرتے ہیں۔

یہ بات بھی عام تجربہ کی ہے کہ چھوٹے بچوں کی قوت ارادی اور قوت تمیز
اور اُنکی ہمت اور حمیت کو سب ہی گھر کے بوڑھے مرد اور مستورات اپنی لاعلمی
میں قطعی طور پر ایسا نیست و نابود کر دیتے ہیں کہ وہ عمر بھر کسی کام کے کرنے میں نہ
اپنے اوپر ذرا بھی بھروسہ کر سکتے ہیں اور نہ کوئی صحیح رائے قائم کرنے ہی کے اہل رہ جاتے
ہیں۔ اور نہ انہیں شجاعت یا اپنی عزت اور توقیر کا کوئی خیال ہی باقی رہتا ہے۔
اسکی وجہ یہ ہے کہ کوئی گھڑی ایسی نہیں گزرنے پاتی جبکہ یہ بوڑھے اور پھر
بڑے بچے بھی گھر کے بچوں پر نہ چلاتے رہتے ہوں۔ چاہتا ہے کہ بچوں کو کھیلنے
کودنے دوڑنے دوڑانے ہنسنے بولنے سے ہر وقت روکا کرتے ہیں اور
ہر گھڑی نچلے اور چپ بیٹھے رہنے کے لئے بس ہشٹ ہشٹ کیا کرتے ہیں۔ اُن کی
کوئی بات چلنے ہی نہیں دیتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان بچوں کے ہاتھ پیروں
تک کا آزادانہ نشوونما نہیں ہونے پاتا۔ اور ہمیشہ بیمار رہتے ہیں۔ اور ان
بوڑھوں سے کڑھا کرتے ہیں۔ اور بدظن رہتے ہیں۔ اندر ہی اندر کچھ کا کچھ سمجھا کرتے

ہیں۔ اور جوانکے بڑے ہونے پر اُن کے مُنھ سے علانیہ نکلنے لگتا ہے۔ اور
پھر کہا جاتا ہے کہ لڑکا گستاخ ہوگیا ہے۔ بے ادب اور بدتمیز ہے۔ جبتک
لکڑی تر ہے موڑی جاسکتی ہے مگر جب خشک ہوگئی تو اکثر آگ سے بھی سیدھی
نہیں ہوتی۔ اسلئے لڑکوں میں اچھے اخلاق کا پیدا ہونا، اُنکا شایستہ، نیک
اور مہذب بننا، لائق، خوش خیال، خوش گفتار۔ اور خوش اطوار، اور
خوش کردار ہونا اور خاصکر اُنکی قوتِ آزادی کا مضبوط اور اٹل ہونا۔ اور
اُنکی قوت امتیازیہ کا بھی نشوو نما پانا اور خودداری اور اپنی توقیر اور اسکی
محافظت کا جذبہ ہونا۔ یہ سب باتیں اُن کے ماں باپ کی خواہش سمجھ
بوجھ توجہ اور کوشش پر منحصر ہیں۔ کیونکہ موجودہ وقت میں ہندوستان
کے موجودہ اسکولوں اور کالجوں سے ہم ان باتوں کی توقع نہیں کرسکتے۔
آجکل اسکولوں میں سگریٹ کے خلاف نہایت ہلکا اور نمایشی جہاد رائج ہے
والدین بھی چاہتے ہیں کہ اُن کے لڑکے سگریٹ نہ پئیں۔ مگر گزارش یہ ہے
کہ جو والدین یہ چاہتے ہیں کہ اُن کے لڑکے سگریٹ نہ پئیں تو وہ خود بھی تو پہلے
سگریٹ چھوڑیں ورنہ اگر کوئی سختی اور جبر اُن پر آپ کریں گے وہ آنکھ بچا کر
پئینگے اور ایک جبر نہ معلوم کتنی بدعادتوں کو پیدا کردیگا۔ دنیا سے کوئی بُرائی جبر
اور قانون سے نہ گئی ہے اور نہ جائیگی۔ جتنا جبر اور جتنی سختی آپ کریں گے اتنی
ہی وہ عادت بڑھتی جائیگی۔ جیسے درخت کی شاخیں آپ کاٹیں وہ اور زیادہ بڑھیگا۔
جب جڑ ہی سے کاٹا جائیگا تو وہ ختم ہوگا۔ اور جڑ ہر چیز اور انسان کی اُسکا
دل ہے۔ جب دل ہی قبول کریگا تب وہ عادت جائیگی

جب میں ہندوستان کے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اور پھر ایسوں کو جنکے
تن پر تاگا تک نہیں سگریٹ یا بیڑی پیتے دیکھتا ہوں تو مجھے یہ دکھائی دیتا ہے کہ
ہندوستان کی عمارت میں گویا آگ لگی ہے ۔ اور دھواں نکل رہا ہے ۔ یہ قہر خدا
ہم ہندوستانیوں پر ہے ۔ اور دوسرا قہر خدا یہ ہے کہ ہم کو اپنی ہی آنکھوں اپنا
مکان جلتا ہے بس دیکھنا پڑا ہے ۔ تیسرا قہر خدا یہ ہے کہ بچوں سے سگریٹ
چھوڑوانے کا ذریعہ قانون اور حکم قرار دیا گیا ہے ۔ اور چوتھا قہر یہ ہے کہ جو والدین
اور جو ماسٹر بچوں سے سگریٹ چھوڑوانا چاہتے ہیں وہ خود بھی سگریٹ پیتے ہیں ۔
آپ غور کریں کہ جنھوں نے خود سگریٹ نہیں چھوڑا ہے ان کی ہدایت
کا کوئی اثر کسی پر ہو سکتا ہے ۔ اور نہ انھیں اسکے چھوڑنے کی تکلیفوں اور دقتوں
اور پھر ان پر عبور پانے کی تدبیروں کا کوئی احساس ہی ہو سکتا ہے ۔
کب بھلا یہ ممکن ہے کہ بچے صرف ایک حکم کے اجراء سے سگریٹ پینا چھوڑ دیں
دنیا کیسی بھول میں ہے ۔ اور کیسی گمراہ ہے ۔ یہ تو ایسی ہی بات ہے کہ وہ لوگ
خواہ ملکی ہو یا غیر ملکی جو موٹروں میں گھومتے ہیں اور ولایتی کپڑوں میں ملبوس
ہیں ۔ اور ملوں اور بڑے بڑے کارخانوں کے مالک ہیں وہ ہندوستانیوں کی
بے روزگاری دور کرنے کے طریق و ذرائع تجویز کرنے کے لئے مقرر ہوں ۔
یا جو لوگ ہماری ملکی اور اقتصادی آزادی چھین کر جی رہے ہوں وہ ہماری
آزادی اور آزادی کے برتنے کے لئے آئین بنائیں اور خصوصاً وہ ہندوستانی
جو اپنی ہی ملک کی پھوٹ اور بیر پہ جیتے ہوں ، جنکے ٹھاٹھ ہماری خانہ جنگیوں
پہ کھڑے ہوں انھیں سے یہ توقع کیجائے کہ وہ ہندوستان کی جملہ قوموں میں

اتفاق اور یکجہتی پیدا کریں۔

اسلیے حقیقت کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ اپنے اور اپنے
بچوں کے دلوں سے کوئی بھی بری عادت اور سب برائیوں کی جڑ خود غرضی کو دور
کرنے کے علاوہ مصمم ارادہ کر لینے کے باقاعدہ اندرونی دیکھ بھال اور باقاعدہ
علاج اور عمل کی ضرورت ہے۔

اپنے ملکی بھائیوں اور خاص کر ان لوگوں سے جو ہندوستان میں ایک جمہوریت
قائم کرتے ہیں میرا یہ خطاب ہے کہ یہ ممکن ہے کہ ہم اور آپ اپنی غلامی کی زنجیر
کو آج بالکل کاٹ لیں یا دوسرا کوئی از خود ہی انکو مجبوراً کاٹ دے۔ لیکن کیا
ہم آزاد ہو گئے ہیں؟ یقینی نہیں۔ آزاد وہی انسان وہی ملک ہے جو اپنے
دل سے آزاد ہو گیا ہے۔ اور دل سے آزاد وہی شخص ہے جس نے خود غرضیوں
کو دل سے نکال دیا ہے۔ اور جو اپنے خیالات اور افعال میں بے غرض ہے۔
اسلئے جو اپنے ہاتھ کی بات ہے اپنے قابو کی بات ہے اور اپنے دل کی
بات ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہم اپنے دل کو خود غرضی سے پاک کر کے شخصی طور پر خود
ہی آزاد ہو جائیں اور جو اس طرح آزاد ہے وہ ایک قوم ہی کو کیا بلکہ ایک ملک
کو اور دنیا ہی کو اکیلا آزاد کر سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ ہم ہندوستان میں جمہوریت قائم
کر لیں۔ اور ظاہرا آزاد ہو جائیں جسم پر کپڑے بدل لینے سے کیا؟ حالانکہ وہ بھی
ایک لازمی اور قدرتی بات ہے۔ جبتک ہمارے دل خودی اور خود غرضیوں سے
پاک نہ ہوں اور ہم اپنے دل میں پاک نہ ہوں اور ہم اپنے دل میں آزاد نہ ہوں۔ اسلئے
اس موقعہ پر میں اپنے ہم وطنوں کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں کہ ایک تو وہ فوراً ہی

اسی وقت اور اسی گھڑی اپنے دلوں کو خود غرضیوں سے پاک کریں۔ اور
واقعہ یہ ہے کہ دل کے اوٹ پہاڑ ہے۔ اگر ہمارے دل کو لگ جائے
اور ہم سمجھ جائیں تو ہم ایک منٹ ہی میں اپنے دل کو خود غرضی سے پاک کر سکتے
ہیں۔ اور نہیں تو ہم اپنی تساہلی اور بے توجہی کی وجہ سے اور آج اور کل کر کے
برسوں اور عمریں گزار دیں۔ اور دوسرے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان وطن کا
یہ بھی فرض اولین ہے یعنی سب سے پہلا فرض ہے یعنی ان کے جمہور کا پہلا فرض
یہ ہے کہ وہ اپنے اسکولوں اور کالجوں کے درجہ بدرجہ مادری زبان
میں مندرجہ ذیل جیسے مضامین پر کتابیں لکھوائیں اور پڑھوائیں اور جب کے
درجہ بدرجہ کالج تک پڑھنے سے ہندوستانی مجمع کے طالب علموں کے
دلوں پر وہ اصول نقش ہو جائیں اور [illegible] وہ اصول ان کی زندگی میں
عمل میں آئیں اور ان کی زندگی کا مدعا بن جائیں تاکہ آئندہ اپنی نسل خود غرضی
سے پاک ہو اور اپنے ماسٹروں اور پروفیسروں کو بھی اسکولوں اور کالجوں
میں مقرر کریں جو مندرجہ ذیل جیسے اصولوں پر خود بھی عمل کرنے والے ہوں
جن کو اپنے کرایہ کی [illegible] پیش نظر نہ ہو۔ بلکہ جو علم کو علم کے خیال سے
دیں اور اپنے فرض کو فرض کے خیال ہی سے نہیں بلکہ [illegible] کے ساتھ
ادا کریں۔ اور ان اصولوں پر اپنے درجہ کے لڑکوں کو عالم باعمل بنائیں
ورنہ یاد رکھئے کہ ہماری آزادی اور ہمارا جمہور غلامی سے بھی زیادہ عذاب کا باعث
ہو جائے گا۔ مجھکو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ [illegible]
نکلتے ہوئے نوجوانوں کی موجودہ اعلیٰ تعلیم کے باوجود وقت کی پابندی

اور اپنی بات اور ارادہ پر قائم رہنے کے بارے میں انکی دل دکھانے والی کمزوریوں کا تلخ تجربہ مجھکو ذاتی طور پر بارہا ہوا ہے۔

مثال کے پر کچھ اُصولی باتیں جن پر بچوں کو اوائل عمر ہی سے ڈالا جائے

(۱) سچ بولنا یعنی جو بات اپنے دل میں ہو وہی کہنا یعنی یہ نہ ہو کہ دلمیں کچھ ہے اور زبان پر کچھ اور ہو۔ اور جیسا دیکھا یا سنا ہے ویسا ہی بے خوفی کے ساتھ کہنا یعنی جھوٹ نہ بولنا۔

(۲) کسی کی چیز بغیر اسکی اجازت کے نہ لینا۔

(۳) برہمچریہ اور جسم کو تندرست اور طاقتور رکھنا۔ اور جملہ علوم و فنون کو حاصل کرنا۔

(۴) کسی کو بھی اپنے خیال میں یا گفتگو یا فعل سے ایذا نہ پہونچانا بلکہ سکھ دینا۔

(۵) اپنے جسم اور خیالات کو پاک رکھنا۔

(۶) وقت کو ضایع نہ کرنا۔

(۷) صبر و قناعت کا ہونا۔

(۸) اپنے والدین اور اپنے بزرگوں کی عزت کرنا اور اُن سے اپنے فرائض متعلقہ کو پریم کے ساتھ ادا کرنا۔

(۹) عورت کی عزت اور اسکا ستکار اپنی بیوی کے علاوہ استری جاتی کو اپنی ماں اور بہن سمجھنا اور ویسا ہی برتاؤ کرنا۔

(۱۰) برے اور کڑوے الفاظ اور گالی منھ سے نہ نکالنا۔

نوٹ:۔ علاوہ ہندوستان کے تقریباً ہر ملک میں یہ کوئی جانتا ہی نہیں کہ گالی کیا ہے۔ اور ہندوستان میں تو پڑھے لکھے لوگوں میں بھی گالی اکثر تکیہ کلام ہے۔ اور دیہاتیوں، زمینداروں، پولیس والوں، اور ان پڑھ لوگوں میں تو گالی دینا گویا سانس کا اندر جانا اور باہر آنا ہے۔

(۱۱) انسان کی توقیر کرنا اور اس سے محبت اور مساوات کا برتاؤ کرنا۔

(۱۲) کسی کے حق کو نہ لینا بلکہ جسکا جو حق ہے اسے دینا۔

(۱۳) بدی نہ کرنا، بلکہ نیکی کرنا۔

(۱۴) احسان کرنا مگر احسان نہ لینا۔

(۱۵) ہر شخص سے خندہ پیشانی کے ساتھ برتاؤ کرنا۔

(۱۶) ہر شخص سے میٹھی زبان سے بولنا۔

(۱۷)۔ اپنے دل کو خودی وخود غرضی سے پاک کرنا۔

(۱۸) خدمت انسان، خدمت ملک اور خدمت دنیا کو اپنی زندگی کا خاص مقصد سمجھنا۔

(۱۹) اپنی بات اور ارادہ کا پکا اور دھنی ہونا۔

(۲۰) اور پرماتما کو حاضر و ناظر خیال کرنا اسی پر دھیان رکھنا اور اسی کو اپنا اکیلا راہبر اور حقیقی گرو سمجھنا۔ اور راضی رہنا اسکی رضا میں وغیرہ۔

مجھکو یہ بھی یاد پڑتا ہے کہ ہمارے ملک میں یہ دستور تھا اور ممکن ہے کہ اب بھی کہیں کہیں ہو۔ کہ عموماً والدین اپنے بچوں کے ہاتھوں سے خیرات کرایا

کرتے تھے اور اسطرح انکو خیرات دینے کا عادی بنایا کرتے تھے ۔ یہ سب
اقتدار اور آثار ان ملکوں میں اور خاصکر برطانیہ میں آجکل یہ عام دستور ہے
اور ہمیشہ ہی سے رہا ہے ۔ کہ ہر ایک ماں اور باپ دونوں اپنے بچوں کو غربا
کی تکلیفوں کو انکو دکھلا کر اور سمجھا کر ان پر ترس دلاتے ہیں ۔ اور اُن کے دلوں
میں رحم کو اسکا نشو و نما پیدا کرتے اور قائم رکھتے ہیں ۔ اور ساتھ ساتھ اُن کو
سمجھاتے ہیں کہ جو رقم وہ انکو جیب خرچ کے لئے دیتے ہیں اسکا کچھ حصہ وہ
خیرات میں بھی صرف کریں ۔ اور خصوصاً ہسپتالوں اور اسکولوں کے لیے
ہر ماہ یا ہر ہفتہ مقررہ ہفتہ دیا کریں ۔ جسپر وہ لڑکے خوشی خوشی اور حوصلہ
کے ساتھ کاربند ہوتے ہیں ۔ اسبارہ میں انکی یاد تازہ رکھنے کے لیے
اُن سے اکثر پوچھا کرتے ہیں ۔ کہ اُنھوں نے کیا رقم اور کس خیرات میں دی ۔
اور اپنا اطمینان بھی کر لیا کرتے ہیں ۔ اسیطرح وہ لوگ پچاسوں مثالیں دیکر
اپنے بچوں کے دلوں کو نرم بناتے ہیں ۔ کہ وہ دوسروں کے درد کو محسوس
کرنے کے عادی ہوں ۔ اور حاجتمندوں کو اور خیراتی کاموں میں کھلے دل
خیرات دینے کے عادی بنجائیں ۔ اور جو عادت پھر خصلت بنجاتی ہے
اور وہ انکا ایک درخشان جوہر ہو جاتی ہے ۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان ملکوں
کے اسکول، کالج اور یونیورسٹیاں اور جملہ ہسپتال وغیرہ سب ہی خیرات
یعنی پبلک کے روپیہ پر چلتے ہیں ۔ اور وہ اپنی گورنمنٹ کے دست نگر نہیں
ہوتے ۔ اور یہی وجہ ہے اور آپ نے دیکھا اور سنا بھی ہوگا ۔ کہ ان ملکوں کے
بڑی بڑی دولت اور ثروت والے اپنی وصیت میں اپنی دولت کا زیادہ سے زیادہ

کچھ حصہ ہسپتالوں اور یونیورسٹیوں کو لکھ دیتے ہیں۔ اور اپنے لڑکوں لڑکیوں
یا نزدیکی عزیزوں کو تھوڑا سا روپیہ دیتے ہیں تاکہ یہ لوگ اپنے ہاتھ پیروں
سے پیدا کریں اور دوسرے نہیں اور انکو بے محنت کی دولت پاکر اسکے تباہ کرنے
کا موقعہ ہی نہ ہو۔ لہٰذا میں ملکی بھائیوں سے عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کہ
وہ اس طریقہ پر اپنے بچوں کے ہاتھوں سے انکے جیب خرچ سے دو چار پیسے
یا دو چار آنے یا دو چار روپئے اپنی مقدرت کے مطابق ہمیشہ خیرات
کرنے اور اپنی جیب خرچ کے روپئے کے صرف کے ساتھ اسکا بھی حساب
لکھنے کا خوگر بنائیں۔ اور اُن کے دلوں میں غریبوں اور مصیبت زدوں کی
تکلیف کے احساس کرنے کی بھی عادت ڈالیں۔ یورپی ممالک اور جاپان اور امریکہ
میں تو والدین اور ٹیچر اور پروفیسر وغیرہ بچوں کے دلوں میں حب الوطنی یعنی اپنے
ملک سے محبت کے بیج کن کن طریقوں پر قصّے کہانیوں کے ذریعہ اسکولوں کی
کتابوں کے ذریعہ، لیکچروں، اخباروں اور گیتوں کے ذریعہ بو ڈالتے
ہیں۔ ان خیالات کی پرورش کرتے ہیں۔ انکو اگاتے ہیں۔ پھر وہ
لڑکے عمر پاکر اپنے ملک کے لئے اپنی جان و مال اور اپنا سب کچھ ہنسی
ہنسی اور خوشی خوشی قربان کر دیتے ہیں۔ اسکے بیان کے لئے تو پوری کی
پوری کتاب کی ضرورت ہے۔ بلکہ مجھکو یقین ہے کہ ہمارے ملکی بھائی اس سے
پورے طریقہ پر آگاہ ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میرے لائق ناظرین نے اس بیان
سے اس امر کا بھی بخوبی احساس کر لیا ہوگا کہ اپنے بچوں کے دلوں میں انکی
اوائل عمری ہی سے نامناسب عادت کو پیدا نہ ہونے دیں یا چھڑا دینے

اسکی جگہ بھلی عادتوں کے ڈالنے اور انکو نیک اور مکمل انسان بنانے کے لئے کسقدر دیکھ بھال، تدبیر، احتیاط، جانفشانی، دوراندیشی اور فکر کی ضرورت ہے۔ اور ہمارے ملک میں پہلے یہ دستور تھا کہ گھر کے بڑے مرد اور عورتیں رات کو سونے کے قبل بچّوں کو کہانیاں اور قصّوں کے ذریعے جملہ اقسام کی تربیت دیتی تھیں۔ اور اُن کے دلوں میں شجاعت ہمّت اور دلیری، قوت ارادی، اپنی بات کی آن، وقت کی قدر اور پابندی اور اونچے سے اونچے تخیل رکھنے اور بڑے سے بڑے ہونے۔ عالم بننے، اچھے ہونے اور ملک پر قربان ہونے وغیرہ کے جذبات کو پیدا کر دیتے تھے۔ اور قائم اور دائم رکھتے تھے۔ اور پہیلیوں وغیرہ کے ذریعہ انکی قوت دماغ اور سمجھ بوجھ کو دوبالا اور سہ بالا کرتی تھیں لیکن یہ باتیں اب موجودہ تہذیب کے طاق فراموش کے حوالے کردی گئی ہیں۔ ملک کی خوش قسمتی ہوگی اگر رہنمایان ملک کی توجہ اس جانب بھی ہو۔

یکسوئی کی تشریح اور اسکا حصُول

پچھلے بیان میں میں نے نفسیات میں اُن اوصاف کا تذکرہ کیا ہے جو انسان میں خودغرضی کے ترک ہونے سے قدرتاً آجاتے ہیں۔ ممکن ہے کسی صاحب کو یہ خیال پیدا ہو کہ جو آئیڈیل میں نے اپنے ملک اور دنیا دیگر لوگوں کے سامنے اُن کے عمل کے لئے رکھا ہے وہ ادھر اُدھر سے جوڑے ہوئے الفاظ کا ایک پہاڑ اس کتاب کی وقعت یا اپنی

دقیقیت کو جتانے کے لئے کھڑا کر دیا ہے۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے میرا
یقین ہے کہ یہ اوصاف ہیں جنکو نہ صرف بڑے لوگ ہی بلکہ وہ لڑکے اور
لڑکیاں تک جنکو بچہ سمجھتے ہیں درجہ بدرجہ اور رفتہ رفتہ حاصل کر سکتے ہیں اور ان
اصولوں پر کاربند ہو سکتے ہیں اور ان کا ان پر کاربند ہونا ان کے انسان
ہونے اور خداوند عالم کی طرف سے علم اور عقل دئے جانے کا تقاضا ہے
اگر اس طرف توجہ اور طبیعت ہے تو سب اصول ایک تنکے کی طرح
ہلکے ہیں جنکو ایک لڑکا بھی اٹھا سکتا ہے۔ ورنہ آسان سے آسان کام
کبھی پہاڑ ہی نظر آتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تل کی اوٹ پہاڑ ہے۔
میری یہ درخواست ضرور ہے کہ آپ اپنے خیالات کی دیکھ بھال
کی عادت ڈالیں اور اسکی مشق کریں ابھی وقت آپ تجربہ کر لیں۔ کتاب
کو ذرا دیر کے لئے علیحدہ رکھدیں اور اپنے خیالات کو دیکھیں جہاں آپنے
ذرا آنکھیں بند کیں تو آپکی توجہ اپنے خیال کی طرف گئی۔ آپ اپنے خیال
سے غافل نہ ہوں۔ آنکھ مت کھولیں بیٹھے رہیں۔ آپ صرف دیکھتے رہیں کہ وہ
کیا کیا باتیں اور کس کس کو آپکے سامنے لاتے ہیں اور آپکو کہاں کہاں
لیجاتے ہیں۔ پھر دیکھئے آپکو ایک نئی دنیا ہی دکھلائی دیگی اور آپکو ایک
عجیب لطف معلوم ہوگا۔ اور وہ دلچسپی آپ میں آئیگی جو باہر کہیں
مشکل سے ملیگی۔ اور پھر ساتھ ہی ساتھ آپکو اپنے اوپر ہنسی بھی
آئیگی۔ آپ اپنے اوپر ہنسیں گے جب آپ یہ غور کریں گے کہ عادتوں
میں کسی خطا یا مفید باتیں چھپی ہیں جنکے لئے مدد کی درخواست کرتا ہے

مدعا علیہا ور گواہ بلائے جاتے ہیں۔ وکلا عدالت کو معاملہ سمجھاتے ہیں
اور اپنی اپنی دلیلیں پیش کرتے ہیں اور ہم ہیں کہ اپنے رشتہ داروں،
دوستوں، غیروں اور دشمنوں سب کے مقدمے اور جھگڑے بغیر انکی
درخواست کے اور بلا انکی خواہش کے اور پھر انکی غیر حاضری میں خود
ہی پیش کر لیتے ہیں اور خود ہی فیصلہ دیدیتے ہیں اور دنیا بھر کا عذاب
خواہ مخواہ مفت خدا کے لئے مول لے لیا کرتے ہیں اور اپنا وقت ضائع
کیا کرتے ہیں اور پریشان بھی ہوتے ہیں۔

یہ بات تو ٹھیک ہے کہ جسکی ہم عزت کرتے ہیں یا جسکو دوست سمجھتے
ہیں ہم پسند کرتے ہیں اسکو اپنے جسم کی سب سے اونچی اور سب سے اعلیٰ جگہ یعنی
دل و دماغ میں بٹھلانا واجبی بات ہے۔ مگر حیرت اور ہنسی کی بات
آپ یہ دیکھیں گے کہ آپ اُس کسی شخص کو بھی جسکو آپ اپنا بیری یا
دشمن سمجھتے ہیں اسکو بھی اسی جگہ پر بٹھلایا کرتے ہیں اور اسی کا ہر وقت
دھیان۔ اُسی کا ہر وقت تذکرہ اور اُسی کی ہر کسی پاس سے شکایت
اُٹھتے بیٹھتے اور ہر وقت کیا کرتے ہیں اور معمولی سے معمولی اور ننھے
اور خاص کر بیتے ہوئے جھگڑوں اور تکلیفوں کو بھی اپنے خیال اور دماغ
میں جگہ دیکر انہیں کو سیتے رہتے ہیں۔ اور اپنا وقت ضائع کرتے ہیں
بہرکیف جہاں آپنے اپنے خیالات کے ملانے کی عادت ڈالی تو یہ
بات خود بخود اور یقینی حاصل ہوگی وہ یکسوئی ہے۔ میں سمجھدار لڑکے
اور لڑکیوں دونوں سے اصرار کرتا ہوں کہ چاہئے وہ میری اس کتاب کی

کسی بات کو مانیں یا نہ مانیں، چاہے وہ میری کتاب کا ورد بھی نہ کریں مگر وہ شروع شروع میں منٹ دو منٹ اور پھر اور زیادہ مگر پابندی کے ساتھ بیٹھکر اپنے خیالات کو دیکھنے اور اُن کے پیچھے چلنے کی عادت تو ضرور ڈال لیں اور اسکی مشق بتدریج بڑھاتے جائیں۔ آپ کا رہ راست پر ہمیشہ چلنا اور بلند سے بلند چوٹی پر پہونچنا یقینی ہو جائیگا جیسے سوتے کو اگر کھول دیا جائے تو پانی اپنا نشیب آپ ہی ڈھونڈھ لیتا ہے۔ اور سمندر میں جا گرتا ہے جو کریگا وہ پائیگا۔ اس مشق سے آپکو از خود سکوت حاصل ہوگا۔ آپکو یکسوئی حاصل ہوگی اور یکسوئی میں از خود پختگی آجائیگی۔ آپکو خوشی محسوس ہوگی۔ آپکے دماغ میں قوت آئیگی اور وہ صاف شفاف ہوگا۔ بہ الفاظ دیگر اسمیں روشنی آئیگی جس سے آپکو ہر ایک بات اور ہر ایک چیز اور اسکے راز صاف صاف نظر آئیں گے۔ اور یقین کا بھی یہ شرطیہ علاج ہے۔ اور یہ یکسوئی کا وہ اکیلا اور نرالا اوزار ہے جو آپکو اپنی تعلیم میں اور اپنے امتحان میں جسکا آپکو خود تجربہ ہے کام آتا ہے۔ اور دنیا کے ہر ایک کام میں اسی کے ذریعہ ہمکو کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ عروج اور کمال حاصل ہوتا ہے۔ خواہ وہ دنیوی ہو یا روحانی۔ دوسری ایک ذرا سی بات آپ کے عمل کے لئے یہ ہے کہ جبکہ آپ اپنی آنکھوں کو پیروں کو اور کل جسم کو آرام دیتے ہیں تو اپنے خیالات کو بھی گھڑی دو گھڑی کے لئے دن بھر میں آرام دیں۔ اور یہ عادت ڈالیں کہ اسوقت آپ کے دماغ میں کوئی خیال

ہی نہ آسکے۔ یہاں سکنڈ در سکنڈ کی عادت ہو گئی تو پھر منٹ در منٹ
اور پھر اور زیادہ کی عادت اور مشق ہو جائیگی۔ پھر جس کے ثمرہ کا اندازہ
اور بیان دونوں ہی طول ہیں۔ اور جسکی جھلک میں آگے چلکر دونگا۔ اور
یہ بات بھی قدرت کی جانب سے ہے کہ انسان کی روح کو بھی صفائی
قلب اسوقت بہم پہونچا کرتی ہے جبکہ علم غور و فکر کی برکت سے دلمیں خیال
کرتے رہنا چھوٹ جاتا ہے۔ روح کمال کی طرف رجوع ہوتی ہے جذب
نفع اور دفع ضرر کے خیالات نہیں ستاتے منظور نظر سے غائب ہونے
لگتے ہیں اور ناظر پر نظر رہا کرتی ہے۔ اور یقین مانئے کہ جبتک ہماری نظر
کا رخ باہر کی طرف ہے اسی وقت تک دکھ ہے۔ اور جب ہم اندر دیکھنے
لگتے ہیں تو یہی دکھ سے نجات ہے۔

کوئی مشکل بات نہیں ہے ناک سے باہر نکلنے والی ہوا کو خفیف
زور سے نیچے کی طرف دھیرے دھیرے پھینکا جس سے پیٹ اندر
کی طرف سکڑنے لگتا ہے تو دو چار ہی بار ایسا کرنے سے سبکدوشی حاصل
ہو جاتی ہے۔ دماغ ہلکا معلوم پڑتا ہے۔ اور خوشی محسوس ہوتی ہے۔
دماغ پر کوئی زور یا بوجھ ہرگز نہ ڈالا جائے اور پھر دیکھیے تو اسکا نتیجہ ہے
اور اسی کا کرم ہے کہ اکثر اوقات ہوتے ہوتے ایک انسان کا تصرف
چشم زدن میں ہی ہو جایا کرتا ہے۔ یعنی وہ شخص مراقبہ یعنی سمادھی کے دائرہ
میں پلک مارتے ہی یا پلک کے اشارہ سے بھی پہنچ جاتا ہے۔ اور پھر جس
تحریر اور تقریر میں نہ آسکنے والے بے پناہ کیف کے خفیف سرور کا

کچھ اندازہ ہو سکے۔ وہاں منزل کو دیکھ کے سادھی میں آئے ہوئے دو
شعر سے ہو جائیگا جسکو اور کسی صاحب نے نہ کبھی دیکھا ہوگا اور نہ کبھی اور نہ
کہیں سنا ہی ہوگا۔ اور نہ کسی کتاب میں دیکھا ہی ہوگا۔ سلہ

در تصور کے تصوف آمدے

پرسیدہ گم! بس تصوف آمدے

جسکا ترجمہ تصوف میں یہ کیا:- ایک اگر تا میں کب سادھی ہو گئی پوچھتے
ہی پوچھے بس سادھی ہو گئی۔ سلہ

مجھکو دنیا ایک دن سے تھا یہ کہ میں بھی سے چلوں

حسرتوں کا ایک بوجھا سر پہ ہو گئے نجات

اس دنیا میں آپ لاکھوں آدمی ایسے پائیں گے جو یا تو اپنی شخصیت
یا اپنے نام یا اپنے پیٹ کی خاطر ہزاروں بھیس میں پھرتے ہیں اور
عجیب سے عجیب طریقے اختیار کرتے اور خوف بھی دلاتے ہیں کہ یہ روحانی
راستہ کیسا مشکل ہے اور لوہے کا چنا ہے۔ مگر میں ایک حقیر شخص
اور میری یہ کچھ پیپوں والی کتاب آپکو یہ یاد دلاتی ہے کہ یہ علم بھی جملہ
اور علموں وغیرہ کی طرح موم ہے اور تنکے کی اوٹ پہاڑ ہے بلکہ ایک
قدرتی امر بھی ہے۔ کیونکہ جیسے قدرت کی اور چیزیں ہوا، پانی اور
دھوپ اور دنیا کے تمام گیان وغیرہ سب آسانی سے ملتے ہیں بشرطیکہ
ہم اُن کے پاس تک جائیں اور ان کے حاصل کرنے کی کوشش کریں اسیطرح
وہ بھی اور اسکا راستہ دونوں ہی آسان ہیں۔ اور جس کے پانے کا اکیلا

ہی نہ آسکے - جہاں سکنڈ در سکنڈ کی عادت ہوئی تو پھر منٹ در منٹ
اور پھر اور زیادہ کی عادت اور مشق ہو جائیگی - پھر جس کے ثمرہ کا اندازہ
اور بیان دونوں ہی طول ہیں - اور جسکی تفصیل آگے چلکر دونگا - اور
یہ بات بھی قدرت کی جانب سے ہے کہ انسان کی روح کو بھی صفائی
قلب اسوقت بہم پہونچا کرتی ہے جبکہ علم عمل و ذکر کی برکت سے دلمیں خیال
کرتے رہنا چھوٹ جاتا ہے - روح کمال کی طرف رجوع ہوتی ہے - جذب
نفع اور دفع ضرر کے خیالات نہیں ستاتے منظور نظر سے غائب ہونے
لگتے ہیں اور ناظر پر نظر رہا کرتی ہے - اور یقین مانئے کہ جبتک ہماری نظر
کائنات باہر کی طرف ہے اسی وقت تک دکھ ہے - اور جب ہم اندر دیکھنے
لگتے ہیں تو یہی دکھ سے نجات ہے -

کوئی مشکل بات نہیں ہے ناک سے باہر نکلنے والی ہوا کو خفیف
زور سے نیچے کی طرف دھیرے دھیرے پھینکا جس سے پیٹ اندر
کی طرف سکڑنے لگتا ہے تو دو چار ہی بار ایسا کرنے کے بعد طبیعت بحال
ہو جاتی ہے - دماغ ہلکا معلوم پڑتا ہے - اور خوشی محسوس ہوتی ہے -
دماغ پر کوئی زور یا بوجھ اگر ڈالا جاتا ہے اور پھر بھی تو اسکا نتیجہ ہے
اور اسی کا کام ہے کہ اکثر اوقات ہوتے ہوتے ایک انسان کو تصوف
چشم زدن میں ہی ہو جایا کرتا ہے یعنی وہ شخص مراقبہ یعنی سمادھی کے دائرہ
میں پلک مارتے ہی یا پلک کے اشارہ سے بھی پہنچ جاتا ہے - اور پھر جس
تحریر اور تقریر میں نہ آسکنے والے بے پناہ کیفیت کے خفیف سرور کا

کچھ اندازہ ہو سکے۔ وہاں منزل کو دل کے سامنے ہی پا آئے ہوئے وہ
شخص سے ہو جائیگا جسکو اور کسی صاحب نے نہ کبھی دیکھا ہوگا اور نہ کبھی اور نہ
کہیں سنا ہی ہوگا۔ اور نہ کسی کتاب میں دیکھا ہی ہوگا۔ سلہ

در تصوف کہ تصرف آمدے

پرسیدم! بس تصوف آمدے

جسکا ترجمہ تصوف میں یہ کیا:- ایک کہتا ہے کب سادھی ہوگی۔ پوچھتے
ہی پوچھتے بس سادھی ہو گئی۔ سلہ ۲

مجھکو دنیا ایک دن ہے تمنا یہ کہ میں بھی بیچ لوں

حسرتوں کا ایک بوجھا سر سے ہوئے نجات

اس دنیا میں آپ لاکھوں آدمی ایسے پائیں گے جو یا تو اپنی شخصیت
یا اپنے نام یا اپنے پیٹ کی خاطر ہزاروں بھیس میں پھرتے ہیں اور
عجیب سے عجیب طریقے اختیار کرتے اور خوف بھی دلاتے ہیں کہ یہ روحانی
راستہ کیسا مشکل ہے اور ویسے کا چنا ہے۔ مگر میں ایک حقیر شخص
اور میری یہ کچھ بیہودہ سی والی کتاب آپکو یہ یاد کراتی ہے کہ یہ علم بھی جملہ
اور علموں وغیرہ کی طرح معلوم ہے اور تنکے کی اوٹ پہاڑ ہے بلکہ ایک
قدرتی امر بھی ہے۔ کیونکہ جیسے قدرت کی اور چیزیں ہوا، پانی اور
دھوپ اور دنیا کے تمام گیان وغیرہ سب آسانی سے ملتے ہیں بشرطیکہ
ہم اُن کے پاس تک جائیں اور ان کے حاصل کرنے کی کوشش کریں اسیطرح
وہ بھی اور اسکا راستہ دونوں ہی آسان ہیں۔ اور جس کے پانے کا اکیلا

کر دیا تو آپ خود ہی محسوس کریں کہ وہ کیسا ہلکا اور اُجلا اور روشن معلوم ہوتا ہے اوّل تو ہمکو اُسمیں اپنا منھ اور اُسکی خرابیاں اور اچھائیاں سب ہی صاف نظر آنے لگتی ہیں اور دوسرے اُس آئینہ میں جو شفاف ہے آفتاب کا عکس بھی یعنی اسکا جلال بھی نمایاں ہوتا ہے بشرطیکہ اُسکا رُخ آفتاب کی طرف ہو۔ اور اگر آفتاب پورا ہے تو اسکا عکس یعنی جلال اسقدر تیز ہو جاتا ہے کہ آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں اسیطرح ہمارے دل کا آئینہ بھی جب شفاف اور پاک ہو جاتا ہے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ خدا اپنے جلال کا عکس اسمیں ڈالدے۔ ٹھیک اسیطرح جیسے اگر پانی بھرے گھڑے کا منھ ڈھکا ہو تو سورج کی روشنی اسمیں نہیں داخل ہو سکتی۔ مگر جیسے ہی آپنے اُسکا منھ کھولدیا اور اُسکا رُخ سورج کی طرف کر دیا تو اسمیں کرنیں یعنی سورج کا عکس خود بخود ہی پانی میں نمایاں ہو جاتا ہے۔

علاوہ بریں میں پہلے ہی بتلا چکا ہوں کہ خود غرضی کی ضد پریم ہے۔ اسلئے یہ بات بھی قدرتی ہے کہ جب خود غرضی دور ہوئی تو دل میں پریم کا آجانا ایسے ہی لازمی ہے جیسے تاریکی کے جاتے ہی روشنی آتی ہے۔ اور جہل کے جاتے ہی گیان ہو جاتا ہے۔ جب خودی بھی گئی اور انسان خود کو بھول گیا تو اُسکے دل سے اپنے خود کا اور اپنے جسم کا پریم جاتا رہا۔ بلکہ اسکے بجائے اب وہ جملہ خلقت سے دنیا کے جملہ انسانوں، جانداروں اور قدرت کی جملہ چیزوں پہاڑ سے لیکر ایک ذرہ تک سے جنکو آنکھیں دیکھ سکتی ہیں وہ اُن سے پریم کرنے لگتا ہے۔ کیونکہ جو اسکے پریم یعنی اُلفت کا اکیلا مرکز اُسکا معبود ہے۔ وہ ان سب چیزوں میں پنہاں ہے۔ اور جب اپنے معبود کا احساس اسکو نقد بہ نقد ایسے ہی ہوتا ہے۔ جیسے ہم کسی شئے کو اپنی آنکھوں سے دیکھکر اسکا احساس

کیا کرتے ہیں۔ اور پھر وہ اس پریم کے پرم آنند میں ہر وقت مگن رہتا ہے
اور جسکا لطف اسی طرح وہ احساس کرتا ہے جسطرح ایک آدمی مصری
کے لطف کو خود ہی کھا کر محسوس کر سکتا ہے اور جسکا بیان ممکن نہیں ہے
البتہ جس نے یکسوئی کو حاصل کر لیا ہے جس بارہ میں اور جس کے حاصل کرنے
کے آسان طریقے کو بھی پچھلے بیان میں بتلا چکا ہوں یعنی جسکا آئینہ دل انکا اور
صاف ہے یعنی جھیل کی طرح شفاف اور ساکت ہے اور خواہشوں سے
بری اور خودی سے پاک ہے تو خدا کے رحم و کرم کی برکت سے یکسوئی
یعنی مراقبہ یعنی سمادھی کی حالت میں اگر دس پانچ منٹ یا گھنٹہ یا آدھ گھنٹہ
کے لئے بھی آتما یعنی روح اپنے چت یعنی خیال کے اوپر اٹھ گئی ہے تو
وہ بھی اس آنند کو محسوس کر سکتا ہے۔ اور اسکو اپنی روح اور چت
میں ایسے ہی فرق محسوس ہوتا ہے جیسے دھوپ اور سایہ میں۔ اور
گنگا اور جمنا کے سنگم میں کہ حالانکہ دونوں ایکدوسرے سے جدا نہیں ہیں
مگر پھر بھی الگ الگ دکھائی دیتے ہیں۔ اور ایسا ہلکا پن معلوم ہوتا ہے کہ گویا
ہم نے اپنے کپڑے ہی اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دیئے ہوں۔ اور جیسے سانپ
نے اپنی کینچلی ہی اتار دی ہے۔ اور پھر دائیں اور بائیں۔ اوپر اور نیچے
جو کچھ بھی اسکو نظر آتا ہے وہ پریم اور آنند ہی آنند نظر آتا ہے۔ اور اسی
کیف میں اور مکمل یکسوئی کے سرور میں ایسی باتیں جو سب زمانہ اور سب
انسانوں کے لئے یکساں مفید ہوں یعنی جو عالمگیر سچائیاں ہوتی ہیں کبھی کم
اور کبھی زیادہ ایسی نظر آتی ہیں جیسے آسمان سے تارے ٹوٹتے ہوئے

سامنے نظر آیا کرتے ہیں۔ اور بہت سی سچائیوں کو نہ کسی کتاب میں دیکھا تھا اور نہ کسی سے سنا تھا۔ اور روزمرہ کی معمولی یکسوئی میں تو اور خاص کر صبح کے وقت کتنی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں۔ اور ایسے ہی لوگ اپنے فرائض متعلقہ کو بھی اسی یکسوئی اور نہایت پریم اور سرگرمی کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ جو بھی وہ کام کرتے ہیں وہ بے تعلقی کے ساتھ کرتے ہیں اور جو کام بے تعلقی کے ساتھ کئے جاتے ہیں انکی کامیابی میں تو خوشی ہوتی ہے اور نہ ناکامیابی میں رنج۔ ایسے لوگوں کی نظر نتیجہ پر نہیں ہوتی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جہاں تک اُن کا فرض ہے وہ یہ ہے کہ وہ اُس کام کو کریں۔ کیونکہ نتیجہ یعنی اسکا پھل یہ خدا کے ہاتھ کی بات ہے۔ اور جو کام نتیجہ کی امید رکھکر کئے جاتے ہیں وہ فعل کہلاتے ہیں اور جو کام بلا امید نتیجہ اور بے خواہش از خود ہوتے ہیں اسکو فعل سے بریت کہتے ہیں۔ فعل تو دونوں ہی ہوتا ہے، صرف تعلق اور بے تعلقی کے ساتھ کرنے کا سوال ہے۔

میں نے یہاں پر بھی کوئی انوکھی بات نہیں لکھی ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ جبکا آپ کو اور سچائی تک کو ذاتی اور روزمرہ کا تجربہ نہ ہو۔ جن سائینس دانوں، نجوم کے جاننے والوں اور فلاسفروں وغیرہ نے جو تحقیقاتیں اور ایجادیں کی ہیں اور جن جن ایجادوں میں وہ فی زمانہ مصروف ہیں۔ انکی اس کام میں یکسوئی کیا کسی مراقبہ یا سمادھی سے کوئی کم درجہ رکھتی ہے۔ اُنکے دماغ میں بھی تو اسوقت نہ کوئی دوسری خواہش رہتی ہے۔ اور نہ کوئی دوسرا خیال ہی رہتا ہے۔ نہ کسی سے

اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے بلکہ یہ سب ہی باتیں سادہ صاف
اور قدرتی ہیں چونکہ ہم ان سے کچھ بچھڑ گئے ہیں اور ان کو بھول گئے ہیں اسلئے
ہمکو وہ انوکھی اور نرالی اور پیاری دکھائی دیتی ہیں۔ اور جو بھی باتیں میں نے اپنے
اندر کی تحقیقات دیکھ بھال اور عمل کے لئے لکھی ہیں یا آئندہ لکھوں گا ان پر
ذرا غور کرنے اور ایک قدم چلنے کے بعد آپکو پیاری معلوم ہونگی بلکہ دل کو بھی اچھی
لگیں گی۔

جب ہم نے یہ سمجھ لیا اور ہمارے دل میں یہ احساس پیدا ہو گیا
کہ ہر انسان میں وہی آتما یعنی وہی روح اور وہی پرماتما یعنی خدا ہے جو موجود ہے
ہم اور آپ سب کے اندر ہیں۔ اور جب ہم کو یہ محسوس ہو گیا کہ وہی ایک
جان ہم سب میں ہے تو ہم تھوڑا سا بھی غور کرنے سے محسوس کرتے
ہیں کہ اگر کسی گفتگو یا کسی فعل سے یا سردی اور گرمی یا دکھ اور
بیماری سے ہماری آتما کو یعنی ہمکو دکھ ہوتا ہے تو اس سے دوسروں کی آتما
یعنی دوسروں کو بھی دکھ ہونا لازمی اور قدرتی بات ہے۔ اور ہم یہ بھی محسوس
کرتے ہیں کہ جس گفتگو یا فعل سے یا جس چیز کے کھانے پینے سے ہماری
آتما کو خوشی ہوتی ہے اس سے دوسروں کو بھی خوشی حاصل ہونا قدرتی
ہے۔ تب ایسے شخص کا دنیا پر ترس کھانا اور ہمدردی کرنا یعنی اچھے اور
برے دونوں سے اسکی بے لوث محبت کا ہو جانا قدرتی اور لازمی ہے
بلکہ اسکا دل اسقدر وسیع ہو جاتا ہے کہ دنیا اسمیں سما جاتی ہے اور تمام سنسار
کو اپنے پریم کا پاتر یعنی پریم کا مرکز سمجھتا ہے۔ اور اسپر عامل ہوتا ہے۔

جبتک اسکی محبت ایک شخص اور چھوٹے سے دائرہ میں محدود رہتی ہے ۔ اسمیں ایک
خودغرضی کی سی بو بھی بدمزگی کا اندیشہ رہتا ہے ۔ اور جہاں وہ محبت تمام دنیا
اور مخلوقات کے لئے یکساں ہو جاتی ہے ۔ تو وہ تمام دنیا کو اپنے میں لے
کر لیتی ہے ۔ اور دنیا اسمیں سما جاتی ہے ۔ وہ لامحدود اور لازوال ہو جاتی ہے ۔
جس طرح پاک اور شفاف پانی اگر ایک بوتل میں رکھا ہوا ہے اور اسمیں
شراب کی دس پانچ بوندیں ڈالدی جائیں تو وہ بدمزہ اور خراب ہو جاتا ہے ۔
اور اگر دریا میں ہزاروں گیلن شراب کے ڈالدیئے جائیں تو وہ سب پانی
ہی ہو جاتے ہیں ۔
جو لوگ کبھی دنیا میں ایسے گزرے ہیں یا جو اب بھی ایسے موجود ہیں
جن کے پریم کا دائرہ لامحدود ہے جو خدا کی ہر ایک خلقت سے انسانوں سے
اور ہر ایک شئے سے جو انکی نظر میں ہے پریم کرتے ہیں ۔ ان سے دنیا
بھی پریم کرتی ہے ۔ اور دنیا انکی تعظیم کرتی ہے اور انکی زیارت ہی سے
یعنی انکو دیکھکر ہی خوشی اور آنند حاصل کرتی ہے ۔ دنیا اسکا منہ تکتی ہے
وہ بہت کم بولتا ہے ۔ اسکی تحریر اور تقریر میں لفظوں کی قلت ہوتی ہے
اور معنوں کی کثرت ہوتی ہے ۔ اور دنیا اسکی تحریر اور تقریر کے لئے بیاکل
رہتی ہے ۔ اور لاکھوں کی تعداد میں بغیر کسی کے کہے سنے اور اکسانے
جوش سے خود بخود اسکی بات اور اسکے پیغام کو سننے کے لئے اُمنڈ پڑتی
ہے ۔ اور ٹوٹی پڑتی ہے اور اسی کے پیچھے چلتی ہے ۔
یقین جانئے کہ ایسے شخص کا ایک خیال بھی بیکار نہیں جاتا جس

بات پر اپنے خیال کو جما سکتا ہے یا نہ لگا سکتا ہے۔ مشاہدات سے ظاہر ہے
ہم کسی چیز کو دیکھیں یا اسکی طرف سے آنکھیں ہٹا لیں وہ اپنے خیال پر
پورا پورا حاوی ہوتا ہے اور اس پر حکمرانی کرتا ہے۔ اور پھر اسکے خیال
کی طاقت لامحدود ہو جاتی ہے۔ وہ ملک کے ملک اور دنیا کی دنیا کو اسی
جگہ پر بیٹھا ہوا اور راست پر لانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ نہ تو کسی سے
اسکو غرض اور نہ تعریف سے اسکو کوئی واسطہ۔ نہ اسکو کسی سے نفرت
ہوتی ہے اور نہ رغبت۔ نہ کسی دنیوی شئے سے اسکو دکھ ہوتا ہے اور
نہ شکوہ۔ سونے اور مٹی کو برابر سمجھتا ہے۔ شہنشاہ اور غریب کے ساتھ
ایک سا برتاؤ کرتا ہے۔ وہ تو دنیا میں ایسا بے تعلق اور بے غرض رہتا ہے
جیسے کنول کا پتا پانی میں رہتا ہے یا جیسے بطخ پانی پر تیرتی رہتی ہے۔ مگر
جونہی پانی سے باہر آتی ہے اسکے پروں پر ایک بوند بھی نہیں
رہتی۔ چونکہ اسکو دکھ سے نجات یعنی قول اور فعل کی آزادی حاصل
ہے۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو اور بڑے سے بڑے بادشاہ کو اسکے پھیر
کر آخرکار اسکے آگے اپنا سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ وہ نہایت ہی نیک اور
نرم دل ہوتا ہے۔ بچوں کی طرح سادہ مزاج ہوتا ہے۔ ہر وقت خوش
رہتا ہے۔ اسکے ہونٹوں پر اور اسکے چہرہ پر مسکراہٹ اور جلال رہتا
ہے۔ اسکی آنکھیں پریم کے سرور میں گلابی رہتی ہیں وہ تو دنیا کو اپنا
سب کچھ دے چکا ہے۔ اسلئے وہ کسی چیز کا بھی اپنے لئے محتاج نہیں
ہوتا۔ اور نہ وہ اپنے لئے کچھ امتیاز ہی چاہتا ہے۔ اگر کوئی اسکو برا بھلا

گئے تو وہ یہ پہچان لیتا ہے کہ یہ تو اسکا فرض ہے [illegible] کار
اگر کوئی اسکے پاس [illegible] سے اختلاف رائے رکھتا ہے [illegible]
[illegible] اور اگر اسکی توجہ اسطرف دلائی جائے تو وہ [illegible] ہے کہ
یہ تو اسکا فعل ہے سمجھے کیا مطلب - اور وہ اپنی سچائی پر ایسا قائم اور کھڑا رہتا
ہے جیسے ایک ستون زمین میں گڑا رہتا ہے جسکو کوئی طوفان اپنی جگہ سے ہلا نہیں
سکتا - [illegible] اسکی [illegible] ہیں اسکے [illegible] وہ [illegible] انکو
عام طور پر لوگ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں - اُنسے محبت کرتا ہے جنکو
لوگ گنہگار [illegible] اسکو معاف کرتا ہے - وہ ان بلاؤں سے بھاگتا نہیں
جن سے کہ سب دنیا بھاگتی ہے - وہ بے خوف رہتا ہے کیونکہ اول تو اسکے
پاس کوئی چیز ایسی باقی نہیں رہی جسکو وہ چھپائے یا اپنا کہے - اور دوسرے
اسکے دل میں تو کوئی ایسا خیال ہی باقی نہیں جسکو وہ دوسروں سے چھپاتا
ہو - اسکا قدم مستحکم پڑتا ہے - وہ سیدھا تن کر چلتا ہے - اسکی بات بھی
سیدھی ہوتی ہے - اسکو خوف اسلئے بھی نہیں رہتا کیونکہ وہ کسی کو نقصان
پہونچانے کا خیال ہی نہیں رکھتا - بلکہ سب کی بھلائی چاہتا ہے اور کرتا ہے -
اور ہمیشہ سچ ہی بولتا ہے - اور سچ ہی بات کرتا ہے - وہ اپنی آنکھوں کو کسی کے
سامنے نیچا نہیں کرتا کیونکہ اس نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا اور نہ کبھی غلط
مشورہ ہی دیا - اور چونکہ بُرائی اُسکے دل سے نکل گئی ہے اسلئے کوئی بُرائی
اُسپر اثر نہیں کر سکتی نہ کسی تکلیف کا اُسکو احساس اسطرح نہیں ہوتا جیسے
ایک بیمار کو جو ہے کے بوجھ کا احساس نہیں ہوتا - وہ بغیر عالم سے

ہوتے ہیں سب پر حکومت کرتا ہے کیونکہ اُسنے اپنے آپ کو سب کا محکوم بنا رکھا ہے
اور اپنے آپ کو سب پر تج دیا ہے۔ تمام دنیا اسکے حکم پر چلتی ہے کیونکہ
وہ خود اُسکے حکم پر چلتا ہے جو سب کا حاکم ہے جو وہ کہتا ہے اسکو لوگ باور
بھی کرتے ہیں کیونکہ جو کچھ وہ کہتا ہے اسپر وہ خود عامل بھی ہے چونکہ وہ
دنیا کی جملہ خلقت سے محبت کرتا ہے۔ اسلئے وہ دنیا کو جانتا بھی ہے اور
اُسکی دقتوں اور تکلیفوں کو محسوس کرتا اور جانتا ہے، وہ سمجھتا ہے
کہ گیان گویا جسم ہے۔ اور پریم اس جسم کی جان ہے۔ اور واقعہ ہے کہ جو
گیان پریم سے خالی ہے وہ گیان بے جان ہے اور اندھا ہے اور اکثر
بے رحم بھی ہے۔ اسی طرح جو انسان چاہے وہ کتنا ہی عالم اور فلسفی اور
اور سائنسدان کیوں نہ ہو اگر اسکا دل انسان کے پریم کے چراغ سے
روشن نہیں ہے یعنی اسکے دل میں دنیا والوں کیلئے ہمدردی، دیا اور
پریم نہیں ہے تو ایک معنی میں گویا وہ بے جان ہے اور آنکھوں سے
ہی محروم ہے۔

وہ سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ دنیا پریم کی بھوکی ہے۔ اور ہر جاندار
والا بھی پریم کا بھوکا ہے۔ اسلئے وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے پریم کو لٹاتا ہے اور
پریم مانگتا کسی سے کبھی نہیں۔ بلکہ سب کو پریم دیتا ہے۔ اور انسانوں سے
حیوانوں سے، درختوں سے اُنکے پتوں پھولوں اور پھلوں سے دریاؤں
اور پہاڑوں سے جو بھی ذی روح اور غیر ذی روح خدا کی خلقت ہے
اور جس خلقت میں اسکے اندر اور باہر خدا موجود ہے اُن سب ہی سے وہ سچا پریم کرتا ہے

اور اُنکو پریم کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور اس پریم کے پرم آنند میں وہ
سب کچھ کام کرتے ہوئے بھی کھاتے پیتے چلتے پھرتے بات چیت
کرتے مسرور رہتا ہے۔ اور اس فرض کو بھی دل و جان سے اور حقیقی
پریم کے ساتھ ادا کرتا ہے جسکے لئے اُس پیدا کرنے والے نے اُس کو
پیدا کیا ہے۔ اور اپنی اس منزل حیات کو اسی وقت ختم کرتا ہے
جبکہ اُسکا کام پورا ہو جاتا ہے۔

ان چند الفاظ میں ہم نے پریم کے قدرتی اور لازمی اور یقینی اوصاف
کی لامحدود طاقت اور اسکے درجہ بدرجہ ایڈیل کو آپ کے سامنے پریم
کے ساتھ رکھا ہے جسکو ہم نے اور آپ نے خوب سمجھ لیا ہے۔ اور
تسلیم بھی کر لیا ہے یعنی اسکو خوب پڑھ لیا اور دل میں جگہ بھی دی ہے۔ اور
جس کے شیریں پھلوں کا ذائقہ بھی لامحدود ایک انسان کا اور
ہمارا اور آپ کا قدرتی اور ازلی اور اعلیٰ سے ملنے والا حق ہے
اسلئے ہمارے نازنین جبکہ ہم اور آپ اپنے شیشۂ دل کو خود غرضی
سے بالکل پاک کر چکے ہیں۔ اور جب ہم نے یہ سمجھ بھی لیا اور جو کچھ ہے
وہ پریم ہی پریم ہے۔ اور پریم کی لامحدود طاقت اور اس کے آنند کو بھی
جان لیا تو آئیے ہم اور آپ اس اپنے شفاف شیشۂ دل میں پریم کی روح
پرجلال کو بھی آج اور اسی گھڑی آنے دیں۔ تاکہ وہ کبھی اپنی
ہمکو اور آپکو بھی اس بے لوث محبت کا مسرور بنا دے۔ ہم میں بھی جان
آجائے اور ہمکو بھی وہی درجہ انسانیت حاصل ہو۔ جسکے درجہ

پاک ہی رہنا تا ۔ عالم نے انسان کے لئے مقرر کیا ہے اور بتلایا ہے کہ
محبت کرو اُن سے جو مخلوق ہے میری کیونکہ تم کو بھی محبت ہے کہ اُن سے
جنکو پیدا کیا ہے میں نے ۔

جیسے خود کی خود غرضی وغیرہ دل ہی سے پیدا ہوتی ہے اسیطرح پریم کے
پیدا ہونے کی زمین بھی اپنا دل ہی ہے ۔ اور جس طرح ایک بیج ہی سے نکلے
پھوٹتے ہیں ۔ درخت ہوتا ہے ۔ اسمیں پتیاں آتی ہیں اور پھل آتے ہیں اور
پھر اُن پھلوں سے بیج ہوتے ہیں پھر جیسے ہزاروں درخت پیدا ہوتے
ہیں اور جن کے پھلوں کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اُسی بیج کے
پھل ہیں اور جن بیجوں کو دیکھنے سے یہ بھی نہیں دکھائی دیتا کہ اسمیں ایک درخت
اور اسکے پتیاں اور پھل پوشیدہ ہیں اسیطرح ایک کارن یعنی علت پریم کی
کتنے ہی کاریہ یعنی معلول درخت کی پتیاں کتنی ہی شاخیں اور کتنے ہی پھول پھل
پاک باطنی ۔ بے غرضی ۔ بے لوثی ۔ خلوص ۔ راستبازی ۔ راستی ۔ تسلیم
صبر ، قناعت ۔ بلند ہمتی ۔ حمیت ۔ استقلال ۔ بردباری ۔ ہمت ،
شجاعت ، اولوالعزمی ، دیانتداری ، شرافت ، بزرگی ، سچائی ۔ نیکی ۔ خوش
نشانی ۔ عفو ۔ رحمدلی ۔ ہمدردی ۔ فیاضی ، سخاوت ، بلند نظری ۔ خیراندیشی
وغیرہ ہیں ، جنکا شمار مشکل ہے ۔ اور یہ بھی پہچاننا مشکل ہے کہ یہ سب
اکیلے اُسی پریم کے پھل ہیں ۔

دنیاکی دنیا پریم بس ہے ۔ جو طاقت جسکی وجہ سے سورج ۔ زمین وغیرہ

اپنی جگہ پر قائم ہے اور حالانکہ زمین سورج کے چاروں طرف گھومتی ہے
مگر آپس میں ٹکراتے نہیں اور نہ کوئی تصادم ہوتا ہے تو وہ بھی تو کشش
ہی کی طاقت ہے جسکا دوسرے الفاظ میں پریم کہتے ہیں۔
اور چونکہ پریم کے درخت کے پھلوں کو ہم اور تمام دنیا کھاتی ہے
اور اسکے لطف اور آنند کو پاتی ہے اسلئے پریم ہی اکیلا دن کا سا یعنی
سبب ہے جس اکیلے کو اپنے دلمیں جگہ دینے سے ہم دنیا کی تمام اچھائیوں
کو اور نیکیوں کو حاصل کرتے ہیں اور جس سے نہ صرف اپنا بھلا بلکہ دنیا کا
بھی بھلا ہوتا ہے۔ اور یہی مکتی اور یہی نجات بھی ہے۔

پریم

جس وقت ہم اور آپ پریم کا نام اس کتاب میں دیکھیں اور پڑھیں تو
ہم پریم کا وہی نقشہ اپنی آنکھوں کے سامنے لائیں اور اسی پریم کو اپنے دل میں
محسوس کریں جو پریم ماں کو اپنے بچے سے ہوتا ہے جو پریم باپ کو اپنے
بیٹے سے ہوتا ہے جو پریم جانوروں اور پرندوں تک کو اپنی اولاد سے ہوتا
ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بندریا پریم بس اپنے مرے اور سڑے بچے کے
جسم کو اپنے سینہ سے جدا ہونے نہیں دیتی۔ چڑیاں اپنے پیٹ کا کھانا
اپنے بچوں کو کس پریم سے کھلاتی ہیں اور کس کس طرح انکی حفاظت کرتی
ہیں۔ انکی جان کے لئے کیا کچھ نہیں کرتیں۔ کسی جانور حتی کہ بندر اور بلی تو
کتے تک کے بچے کو کیا مجال کوئی چھیڑ دے۔ ماتا کے پریم کا احساس وہ کون شخص

دنیا میں ہے جو نہیں کرتا اور نہیں کرسکتا - اور یقین جانئے کہ جس گھڑی
سے ہم ہندوستانیوں کو اپنے ماتا اور پتا کے پریم کا احساس عمر پاکر یا شادی
بیاہ ہوکر کم ہوگیا ہے یا بطور فرض کے رہ گیا ہے یا جاتا بھی رہا ہے اسی وقت
سے ہماری دنیا بگڑی ہے -

اسلئے پریم محبت وغیرہ جو بھی الفاظ میں لکھ رہا ہوں اُن سے میری غرض
یہ ہے کہ اُن کے پڑھنے کے وقت اور آپکے اپنی آنکھوں کے سامنے آتے
ہی آپکی پریم کی شردھا آجائے جو آپکی ماں کو آپکے ساتھ ہے یا تھا - اور یہ
ہی حقیقی پریم کی اکیلی مثال ہوسکتی ہے اور جو آئیڈیل ہم اور آپ اپنے
سامنے رکھ سکتے ہیں -

گویا اب ہم نے اور آپنے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور اپنے پاک اور
صاف دل میں پریم کے بیج کو بو دیا - اسلئے جیسے ایک باغبان کیاریوں کو
روز نراتا ہے اور ایک لوہے کی سخت اور تیز کھُرپی سے گھاس پھوس
جڑ سے نکال پھینکتا ہے - روزانہ پانی دیتا ہے اور جانوروں اور چڑیوں
سے اسکو بچاتا ہے اور اسوقت تک بڑی احتیاط کرتا ہے جبتک کہ وہ
پورا درخت نہ ہو جاتے اور پھل نہ دینے لگے - جسطرح ہم اپنے لیمپ کی
بتی کو روزانہ لوہے کی قینچی سے کاٹتے اور چھانٹتے ہیں، لیمپ میں تیل ڈالتے
ہیں اور چمنی کو روز صاف کرتے ہیں اسیطرح ہمارا اور آپکا فرض ہے کہ
جس ساری دنیا کے پریم کو ہم نے اپنے دل میں روشن کیا وہ قائم رہے جسکی
روشنی سے اپنی اور دنیا کی تاریکی دور ہو جائے - اور جسکو کوئی بھی ہوا اور

کوئی آندھی گل نہ کر سکے - اور جس پریم کے بیج کو ہم نے اپنے دل میں اسوقت بویا اور اُسکا پانی سے اسکی روزانہ لوہے والی تختی سے دیکھ بھال و نگہبانی پرتال کرتے رہیں اور پھر اُس کے صاف ستھرے پانی سے روزانہ سینچتے ہیں جس پریم کے درخت کے پھولوں کو دیکھنے اور سونگھنے سے نہ صرف ہمارے جی کو خوشی اور آنند ملیگا بلکہ تمام دنیا مہکے گی اور جس مہک کو کوئی دیواری قید باہر جانے اور چاروں طرف پھیلنے اور دنیا کو خوشبو پہنچانے سے روک ہی نہیں سکتی - اور پھر جس درخت کے پھل نہ صرف ہم ہی اور ہمارے بچے اور رشتہ دار کھاسکیں بلکہ ہم اور دل کو لگانے والے کھاسکتے ہیں ؟ اور اسمیں جو آنند ہمکو آتا ہے اور خوشی محسوس ہوتی ہے اُسکو آپ نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ آپ کو اسکے بیج پریم آتا ہے اور مزہ آتا ہے جو پریم سب دور پریم سے کھلایا جاتا ہے ۔

روزانہ دیکھ بھال کا مدعا اور میرا منشا یہ ہے کہ ہمارا پریم سب کے ساتھ بے لوث ہو اور بے غرض ہو - اور اسمیں کسی قسم کی بھی خود غرضی یا خودی یا خود نمائی کا خیال نہ آنے پائے ۔ اسلئے بھی وہ تدبیر ہے اور وہی طریقہ ہے کہ ہم اپنے جملہ خیالات ، گفتگو اور افعال کی جانچ کریں - اور اسکو ایک نوٹ بک میں لکھیں - اور اُٹھنے اور کرنے اور نہ کرنے کے قابل باتوں کو اسمیں درج کریں اور اس نوٹ بک کا روزانہ مطالعہ کیا کریں - اور جس سب باتوں پر آپکے دس یا پانچ منٹ سے زائد صرف نہ ہوگا ۔

اور جس بھی بوڑھے جوان اور بچے پر اور جس جاندار اور جس شے پر بھی

اور ہماری نظر کی شعاعوں میں اور ہماری گفتگو میں اور ہمارے جملہ افعال میں
پریم ہی رہے۔ ہم جسکی طرف دیکھیں تو پاک محبت بھری آنکھوں سے دیکھیں
اور ہماری آنکھوں سے اور ان سے دیکھنے کے ڈھنگ اور طرز سے اور قدرتی
طور پر اسوقت ہمارے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ سے از خود پریم ٹپکے اور ٹپکتا
دکھائی دے۔ جس سے بات کریں تو محبت سے کریں اور شیریں زبانی
سے کریں اور جس پریم کی بات کو سننے والے کا دل از خود محسوس کرے اور
ہمارے حرکات و سکنات جو کبھی متحرک ہوں وہ بھی پریم سے متحرک ہوں تاکہ
اس پریم کی سچائی کا حق الیقین اور عین الیقین ہر اس شخص کے دل کو ہو جسکے
لئے ہم کوئی کام یا جسکی ہم کوئی خدمت کرتے ہیں۔ اس عادت کا ڈالنا اور پھر اس
عادت کا خصلت بنجانا بالکل ہی آسان ہے۔ شرط یہ ہے کہ ہماری توجہ اس
طرف ہو اور ہم اسکو دل سے مشق کریں۔ دشمن بھی اگر کوئی ہو تو دوست
بنجاتا ہے۔ مخالف بھی کوئی ہو تو ہم خیال بنجاتا ہے۔ سخت دل بھی کوئی ہو تو
نرم پڑجاتا ہے۔ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ اگر کوئی ہم سے گرم ہو کر اور بلند آواز سے
بات چیت کرتا ہے اور ہم اسکا جواب آہستگی اور نرمی سے دیتے ہیں تو
پھر وہ شخص بھی اپنی آواز نیچی نرم اور دھیمی کر لیتا ہے۔ اور جہاں آپ نے
اپنے خیالات گفتگو اور افعال میں ہر کس و ناکس سے پریم کرنا شروع
کر دیا تو آپ خود فوراً دیکھیں گے اور آپ کو حیرت ہوگی کہ وہ لوگ بھی آپ سے
کیسا پریم کرتے ہیں۔ اور آپکی توقیر کرتے ہیں۔ جو لوگ آپ کی طرف متوجہ
بھی نہ ہوتے تھے بلکہ چاہے جو لوگ آپکو حقیر نگاہ سے بھی پہلے کیوں نہ

دیکھتے ہوں وہ تک آپ سے توقیر اور پریم کا برتاؤ کرنے لگیں گے۔ اور آپ کو تعجب ہوگا۔ ساتھ ہی ساتھ آپ کا وقت بھی ایسے ہی گذریگا جیسے رات کے بعد دن آجاتا ہے اور جیسے لیمپ جلا اور تاریکی گئی۔ اور سب کام وقت سے خود ہوتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

غور کرنے کی بات ہے کہ اپنی اولاد سے ہمکو اور اپنی اولاد کو ہم سے نہ بغض ہوتا ہے نہ حسد، نہ کوئی رقابت اور نہ نفسانیت، نہ خوف اور نہ نفرت اور نہ کسی قسم کی خود غرضی چاہے وہ کتنے ہی مفلس کیوں نہ ہوں نکھٹو اور بدشکل کیوں نہ ہوں۔ اور دنیا کی نگاہوں میں بڑے کیوں نہ ہوں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو انکو ہم سے اور ہمکو اُن سے پریم ہوتا ہے اور جو فعل قدرتی ہے۔ اور دوسرے چاہے اپنے بچّوں کے کسی فعل کو بُرا سمجھیں مگر ہم اُن بچّوں کو بُرا نہیں سمجھتے۔ اسیطرح ممکن ہے کسی شخص کے بُرے فعل سے ہمکو کھنچاوٹ ہو مگر اُس انسان سے کھنچاوٹ یا نفرت کا ہونا مناسب نہیں۔ بلکہ قدرتی طور پر اُس سے بھی ہمدردی اور بھلائی کا خیال اور برتاؤ ہونا چاہئیے۔ جو ہم اپنے بچّوں اور عزیزوں سے کرتے ہیں۔ علاوہ بریں جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ خداوند عالم بھی کسی اپنے بندے سے اسکے منکر اور بداعمال ہوتے ہوئے بھی اُس سے نفرت اور تعصب نہیں کرتا تو ہمکو کسی انسان سے نفرت یا تعصب کرنے کا کیا حق ہے۔ اور اُس سے فائدہ ہی کیا ہے۔ اسلئے جس دل میں پریم ہوگا اور جو یہ محسوس کرتا ہے کہ ساری دنیا اور سب انسان اور مخلوقات اُسی ایک کی مخلوق ہیں۔ اُسی ایک کے پیدا کئے ہوئے ہیں تو اس

چونکہ انسان کے اکثر افراد فطرت کے مطابق خواہش اور ضرورت
یہ ہے کہ باہمی میل جول قائم اور دائم رہے۔ جس میں حقیقی لطف بھی ہے تو
میری طرح میرے پیارے ناظرین اول تو آپ مذکورہ بالا باتوں سے اگر
اب تک نہیں بچتے ہیں تو اب آن سے ایسے ہی بچیں جیسے طاعون سے لوگ
بچتے ہیں - دوسرے اپنے گھر اور باہر والوں دونوں سے وہی بات چیت
کیا کریں جو اُنکے خیالات اور جذبات کے موافق ہوں۔ اور جو اُنکو زیادہ مقبول
خاطر اور عزیز ہوں - اور یقین جانئے کہ جس گھڑی سے میں نے یہ طے کیا کہ
لطف اسی میں ہے کہ گھر اور باہر والوں کے دلوں میں میری طرف سے ذرہ بھر
بھی کبیدگی نہ رہے بلکہ انتہا ہے باہمی دن دونا اور رات چوگنا ہو تو
میں نے ہمیشہ ہمدردی دلی اور خندہ پیشانی کے ساتھ گفتگو کی اور اسمیں
ان باتوں کو اور ان کے نقطۂ نظر کو اپنے مد نظر رکھنا شروع کیا جنمیں
مجھ سے گفتگو کرنے والوں کو مسرت اور دلچسپی ہے اور اُن کے نقطۂ نظر
کو اپنی سمجھ اور ہوش کی تابع کرنا بھی شروع کر دیا جس سے آن کی آن میں مجھ
میں دلی اور بیرونی گھر دونوں میں ایک حیرت انگیز اور عظیم اور روح افزا
تبدیلی واقع ہوئی جس کا بخوبی احساس مجھکو ہوا اور ہوتا ہے۔ اور اب
مجھکو اپنی کم عقلی اپنی کچھ نہ کہنے میں اور دوسروں کی دل لگا کر دیر تک بھی
خوب سننے میں زیادہ لطف آتا ہے۔ اور پھر ایک چپ ہزار چپ
کی قیمت عقلمند سے کون واقف نہیں۔

میں یہ بھی خیال رکھتا ہوں کہ ہر انسان اور بچوں کے بھی دل ہے بلکہ

جوش ہے اور جرأت ہے۔ ان کو اپنا اور اپنی بات کا پاس ہے۔ اپنی
خودداری کا احساس ہے۔ یہ بھی کچھ راستے سیکھتے ہیں اور کسی گنتی میں
ہیں۔ انکے دل کو بھی ٹھیس لگتی ہے۔ انہیں بھی حسرت ہے۔ چنانچہ اُن کے
جذبات کے احترام کرنے کا، اُنکی معمولی بھی ترقی اور پسندیدہ افعال پہ
ستائش اور بڑھاوا دینے کا۔ اُنکے عیوب پر پردہ ڈالنے مگر شکر اسکے
ہوتے ملائم الفاظ میں کبھی کبھی غیرت دلانے کا، بسا اوقات اُنکی فروگذاشتوں
اور نقائص سے آنکھ بچا کر بھی موقع ہے۔ اور گاہ بگاہ انکو عبرت۔ نصیحت
اور مشورہ دینے کا اور پھر اُنکے اعلیٰ جذبات کو اُکسا کر اُن سے بہترین توقعات
کی توقع کا اور اکثر اُنکی پوشیدہ اور خفتہ طبعی قوتوں اور استعداد کو خود سمجھنے
اُنکو اُبھارنے اور باہر لانے اور اُن لڑکوں کو اُن سے واقف کرانے اور
اُنکو استعمال میں لگوانے کا اور ہمیشہ اور ارادتاً بھی اُنکی دلچسپی اور دلی تحسین کرنے
کا نہایت فرحت بخش اور کثیر ثمرہ مجھکو اور اُن کو دونوں کو ملا ہے۔ علاوہ بریں
گھر کے لڑکے مجھ سے بےخوف ہیں۔ خوش ہیں۔ خوب پڑھتے ہیں۔ خدمتگزار
ہیں۔ مشکور ہیں۔ اور سب سے زیادہ میرا احترام بھی کرتے ہیں۔

چنانچہ اسیطرح، اپنے سب ہی ساتھ رہنے والوں کے خیالات اور جذبات
کے احترام سے اُنکی خوبیوں اور جوہروں پر اظہار مسرت سے اُنکی چھوٹی چھوٹی خدمات
پر بھی اظہار تشکر سے اور اُنکی غیبت میں اُن خدمات کے سراہنے سے اُنکے
شرف اور اُنکے وقار کا لحاظ رکھنے سے اُنکی فضیلت اور اپنی کمزوریوں کو تو تسلیم
کرنے ہی سے ہم اور آپ اُن کے دلوں کو مول لے لیتے ہیں۔ اور اپنے سے

رکھنے کا بار آسان کر سکتا ہے۔

نیز یہ لوگ جو کہ سمجھتے ہیں کہ "نیکی کر اور دریا میں ڈال" وہ اگر کسی ایک
مخصوص شخص یا ادارے کے لئے "فہرست کرو اور بھول جاؤ" اور وہ محبت
جس کا مناسب ہو۔ اپنے دشمن کی ہو۔ اپنے والدین کی اپنے بڑوں کی ہو
چھوٹوں کی ہو۔ اور سب کی ہو۔ مرد ہو یا عورت۔ لڑکا ہو یا لڑکی۔ اور سچ
سمجھ کر پریم سکھ آنند کے خود حاصل کرنے اور پریم کے پھیلانے کا یہی ایک طریقہ
اہم انتظام ہے۔

جو سمجھدار لوگ ہیں وہ اس پیار ایسی نیکی یا احسان کو جو انہوں نے
دوسروں کے ساتھ کیا ہے رائی کے برابر سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ
انہوں نے اپنے فرض متعلقہ کو ادا کیا۔ مگر ساتھ ہی ساتھ دوسروں کے
رائی برابر احسان یا نیکی کو پہاڑ کے برابر سمجھتے ہیں اور اسکو اپنی زندگی بھر نہیں
بھولتے۔ بلکہ ہمیشہ یاد تازہ رکھ کر وہ ان لوگوں سے پریم ہی کا بول بولا
کرتے ہیں۔ اور پریم ہی کا برتاؤ کیا کرتے ہیں۔

سمجھدار لوگوں کی نظر اگر دوسروں کی برائی یا عیب پر پڑتی ہے تو وہ اسبات
پر غور کیا کرتے ہیں کہ آیا وہ برائی اور وہ عیب ان خود میں کس مقدار اور
کس شکل میں ہے۔ آیا اسی شکل میں ہے یا کسی دوسری شکل میں اب
موجود ہے یا کبھی پہلے تھا۔ اور جب اپنے ہی عیبوں اور برائیوں پر نظر
پڑ جاتی ہے تو لو کوئی جہاں میں برا نہیں رہتا۔ اور یہی بہت نیک کمال پر
پہونچنے کا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ ممکن ہے کہ وہ برائی یا عیب کسی

اور سوکھے چنور میں وہ لطف اور مزہ اسکے ساتھ کھانے میں آتا ہے جو کسی امیر کی بڑھیا سے بڑھیا دعوت میں نہیں آتا کیونکہ اس سوکھی روٹی میں پریم بھرا ہے اور کھلانے والا دوست بھی پریم سے کھلاتا ہے اور ہم بھی پریم سے کھاتے ہیں۔ اور اسکا اور ہمارا خیال پریم میں مگن رہتا ہے۔ ہمارے اور اسکے دل میں تو اس خیال کی گنجائش ہی نہیں رہتی اور اسکی شدھ بھی نہیں رہتی کہ وہ کھانا کیسا ہے۔

اگر واقعی کسی کے کھانے پلانے میں ہمکو سچا پریم ہے تو جو لطف اس شخص کے کسی چیز کے کھلانے میں آتا ہے وہ خود کے اسکے کھانے میں نہیں آتا خواہ وہ کتنا ہی زیادہ ہمارے مرغوب طبع کیوں نہ ہو۔ اور ہمکو چین نہیں آتا جب تک کہ وہ شخص ہم سے کچھ کھا نہ لے۔ متواتر اسکا یہ سبب ہم یہ کہتے ہیں کہ ہماری خوشی اسی میں ہے تو وہ ہمکو مشکور کرنے کے لئے یعنی ہمارے اوپر احسان کرنے کے لئے مجبور ہو ہی جاتا ہے۔ اور جہاں یہ پریم ہے وہاں کھانے پلانے کی خدمت کو عام طور پر اپنے ہی ہاتھوں سے انجام دینا اور اپنے عزیزوں کو یہ عظمت سپرد کرنا باعث خوشی و فخر سمجھتے ہیں اور اس امتیاز کو ملازمین کو دینا گوارہ نہیں کرتے۔

ایک وقت تھا جبکہ ہندوستان کے ہر گھر میں یہی طریقہ عام تھا اور اور اجنبیوں تک سے یہی برتاؤ تھا۔ خاصکر گاؤں میں یہ دستور تھا کہ اگر اپنے گھر پر کوئی اجنبی بھی آگیا ہے تو یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ بغیر کچھ کھائے پئے چلا جائے چاہے دودھ ہی ہو یا لسی ہو یا گڑ ہی ہو۔ مہمان کا اپنے گھر آنا خوش قسمتی کا

آتا تھا۔ اور اب بھی کچھ نہ کچھ ہے۔

۱۸۸۹ء کی بات ہے جبکہ میرے والد مرحوم بابو جانکی پرشاد صاحب میرٹھ میں پوسٹ ماسٹر تھے۔ اور میری آٹھ سال کا ہونگا۔ مجھکو خوب یاد ہے کہ اُنکے کسی بھی دوست یا ملاقاتی کے یہاں گیا ہوں اور کھانے کی مجھکو ذرا بھی گنجائش یا خواہش نہیں ہے اور میرا انکار چل بھی گیا تو وہ میری جیبوں میں کچھ میوے ہی بھر دیتے تھے یا اپنے نوکر کے ہاتھوں مٹھائی وغیرہ کچھ نہ کچھ زبردستی ساتھ کر دیتے تھے۔ یہ طریقہ عام تھا۔

اور آج کے دن ہماری تہذیب اسقدر گھٹ گزری ہوگئی ہے کہ مقامی دوست احبابوں کے اپنے یہاں آنے پر زیادہ تر ہم یہ اُن سے دریافت کرتے ہیں کہ چائے منگائی جائے؟ یا ناشتہ منگاؤں؟ اور نوبت یہاں تک پہونچی ہے کہ پانوں تک کے دینے کے لئے اب دریافت کیا جاتا ہے کہ "پان منگواؤں"

ایک مرتبہ مجبور ہو کر اپنے ایک دوست ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی سے یہی اُنکے اعلیٰ جذبات کو اپیل کرتے ہوئے یہ کہہ ہی دیا کہ دیکھو جس قوم کی شہادت تواضع اور تکریم اور تہذیب ہمیشہ سے ضرب المثل رہی ہے آج ہم اور آپ پانوں تک کو منگوانے کے لئے دریافت کیا کرتے ہیں۔ اور پھر ایسا کون گیا گزرا ہوگا جو یہ کہدیگا کہ "ہاں منگوائیے" وہ سمجھدار تھے بات کو سمجھ گئے اور میرے مشکور ہوئے۔ چنانچہ اپنے ناظرین کے غور مادہ اُنکی آگہی کیلئے ان چند سطور کا لکھدینا میں نے ضروری سمجھا تاکہ یہ معلوم ہو کہ پریم سے کھلانا کیا ہے۔ اور جہاں ٹال مٹول، اور خانہ جنگی اور پھر وہ بھی زبانی سے مثال پریم کہاں۔ وہ تو

نمائش اور دنیا سازی ہے۔ جو کھلانا چاہتے ہیں وہ پوچھتے نہیں کیونکہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں۔ غرضیکہ اصل بات صرف اپنے دل یعنی پریم کی ہے۔ نہ کہ پیسہ یا پوزیشن یا طاقت کے ہونے یا نہ ہونے کی۔

اپنے پیارے کا کوئی تحفہ کتنا ہی کیوں نہ حقیر ہو۔ اپنے پیارے کی کوئی نشانی کتنی معمولی، چھوٹی اور بھدی کیوں نہ ہو۔ اپنے پیارے کا خط چاہے اسمیں مضمون آمانی نہ بھی ہو، کچھ زیادہ لکھا ہو یا نہ بھی لکھا ہو اسکو ہم اپنے دل میں جگہ دیتے ہیں۔ اس نشانی کو ہم اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ اسکی وجہ وہ پریم ہی ہے جو اسکے دلمیں ہمارے لئے ہے جسکی وہ نشانی ہے اور وہ پریم ہے جو ہمارے دلمیں اُسکے لئے ہے۔ اور یہی پریم ہے جو اُس تحفہ، نشانی اور خط میں بھرا ہے۔

کتنے ہی زیادہ ہم مایوس ہوں اور کتنے ہی زیادہ ہم فکر میں مبتلا ہوں اور کتنے ہی زیادہ ہم غصہ میں ہوں اپنے بچہ کی پریم بھری ہلکی سی ایک مسکراہٹ سے وہ سب کافور ہو جاتے ہیں۔

اسلئے قدرت ہمکو جو سکھلاتی ہے جس بات کی ہمکو وہ تاکید کرتی ہے وہ یہی ہے کہ سب سے پہلے ہمارے دلوں میں اور پھر یقینی طور پر ہماری گفتگو اور ہمارے افعال میں ہر انسان اور مخلوق کے لئے بے ہوتی اور بے غرض اور اچھوتا پریم ہونا ایک قدرتی فرض ہے۔ اور جو ہر انسان کا ایک قدرتی فعل ہے قدرت کے ساتھ چلنے میں سُکھ ہے۔ اور قانون قدرت کی خلاف ورزی کرنے میں دُکھ ہے۔ اور بے لوث پریم ہی وہ جذبہ ہے جو ہمکو حملہ آور یا نیوں

اور ایثار کے لئے آمادہ کرتا اور ابھارتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کسی سے ہم
پریم کرتے ہیں اسکو اپنے پاس اور اپنے گود میں بٹھاتے ہیں۔ اور اس سے
ہمارے دل کو تسکین محسوس ہوتا ہے۔ چاہے ہم بھوکے اور ننگے رہ جائیں
اور چاہے ہمکو کچھ بھی تکلیف اٹھانا پڑے مگر اسکا بھوکا اور ننگا رہنا یا تکلیفوں کا
اٹھانا ہم کسی طرح بھی دیکھ ہی نہیں سکتے۔ اور نہ اسکی برداشت کر سکتے
ہیں: اور نہ ہم اپنی گفتگو اور نہ اپنے کسی فعل سے اسکو ذرا بھی تکلیف پہنچنے
ہی دیتے ہیں۔ بلکہ اسکی خوشی اور اسکی جان کے لئے اور اسکی اقبال اور
منزلت کی اونچی سے اونچی چوٹی پر پہونچا دینے کے لئے اور اسکو تمام سامان
تسکین مہیا کر دینے کے لئے ہم اپنی تمام زندگی تک بھی نچھاور کرتے ہیں۔
چنانچہ اپنی قربانیوں اور اپنے ایثار ہی سے ہم اپنے ملک اور خلق کے
لئے کیا کرتے ہیں۔ انھیں سے ہمکو ان سے [illegible] کا اندازہ بھی
ہو سکتا ہے۔

کام کو فرض سمجھکر کرنے اور پریم سے کرنے میں فرق

میں اپنے بزرگ اور پیارے نوجوانوں کی توجہ ایک ضروری بات کی طرف
مبذول کرتا ہوں جسکی طرف ابھی حال ہی میں میرا خود کا بھی دھیان ہوا۔ اور
ممکن ہے کہ کوئی زمانہ اسطرف یا کم از کم اسکے وجود کی طرف لوگوں کی توجہ
ہوئی ہوگی۔ اور جسکا اظہار کم از کم میرے علم میں [illegible] سے نہیں ہوا۔

دو بات یہ ہے کہ جو اچھی نیک سے نیک اور پاک سے پاک کام ہم کرتے
ہیں وہ دو طریقہ پر کئے جاتے دکھائی دیتے ہیں ۔

(۱) ایک تو اس کام کو ہم پریم بس کرتے ہیں یعنی وہ کام اسلئے کرتے ہیں
کہ ہمکو اس کام کے کرنے میں پریم ہے یعنی ہمارا پریم ہی اس کام کو کرنے کے لئے
ہمکو اکساتا ہے ۔ اور جسکو ہم نہایت خوشی اشتیاق اور جوش کے ساتھ
کرتے ہیں ۔ اور

(۲) دوسرے اس کام کو ہم فرض سمجھکر کرتے ہیں جسمیں اکثر اوقات
خوشی اشتیاق اور جوش کا ہونا ممکن نہیں ہے ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زیادہ تر لوگ جو نیک کام کرتے ہیں وہ زیادہ تر فرض
سمجھکر کیا کرتے ہیں ۔ اور اس بات کے سمجھنے یا غور کرنے کا خیال کہ ہم اس
کام کو آیا پریم بس کر رہے ہیں یا اسکو فرض سمجھکر کر رہے ہیں ۔ اسطرف تو توجہ
شاید بہت ہی کم لوگوں کی ہوتی ہے ۔ اور دونوں باتوں میں بہت ہی
باریک مگر اہم فرق ہے ۔ میں سمجھتا ہوں اور دیکھتا ہوں اور مجھے یقین بھی
ہو گیا ہے کہ حالانکہ نیکی دونوں طرح صورتوں میں ہوتی ہے مگر دونوں کے پھلوں
اور نتیجوں میں اگر [illegible] سے بھی زمین اور آسمان کا فرق ہو جاتا
ہے ۔ [illegible] طور [illegible] اس طریقہ [illegible] اور سرگرمی میں جن سے دونوں
[illegible] کام ہوتا ہے ۔ [illegible] بہت ہی زیادہ اور کہیں زیادہ فرق
ہو جاتا ہے ۔ جو کام پریم بس کئے جاتے ہیں وہ [illegible] کے ہیں جسمیں
[illegible] ہمیں جان اور عقل دونوں ہیں اور جو کام فرض سمجھکر کئے

جاتے ہیں وہ گویا روح یعنی جان سے محروم ہوتے ہیں - جو کام پریم بس
ہوتے ہیں وہ اضطراری ہوتے ہیں یعنی وہ ازخود ہوتے ہیں یعنی قدرتی طور پر
ہوتے ہیں اور ہماری نگاہ نتیجہ پر نہیں ہوتی - اور جو کام فرض سمجھکر کئے جاتے
ہیں وہ ارادے سے کئے جاتے ہیں - دیکھا دیکھی بھی کئے جاتے ہیں - کبھی
دباؤ یا خوف سے بھی کئے جاتے ہیں اور کبھی مروّت میں اور کبھی کسی امید
کی خاطر بھی کئے جاتے ہیں اور نتیجہ پر نظر رہتی ہے - اسلئے میں اس نتیجہ پر
پہونچتا ہوں کہ جو کام پریم بس ازخود ہوتے ہیں وہ بے لوث، یک رنگ
ایک سار اور مستقل ہوتے ہیں اور اپنے منزل ہی پر پہونچکر ختم ہوتے ہیں
اور جو کام صرف فرض سمجھکر ہی کئے جاتے ہیں انمیں بناوٹ اور تبدیلی
کا بھی اندیشہ ہوتا ہے - اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ قائم نہ بھی رہیں اور ہمکو
منزل مقصود تک نہ بھی پہونچائیں -

اس کسوٹی پر میں نے سب سے پہلے عبادت کو کسا چنانچہ اس اصول
کو مدنظر رکھتے ہوئے میں کہہ سکتا ہوں اور آپ بھی تسلیم کریں گے کہ جو بھی
عبادت ہم کرتے ہیں اگر پریم بس ہم سے ازخود ہوتی ہے تو اسکا لطف
اور اسکا سرور کچھ اور ہی ہوتا ہے - اس عبادت کو یک رنگی اور دوام
حاصل ہے - اور جو عبادت ہم فرض سمجھکر کرتے ہیں تو اسمیں وہ یک رنگی نہیں
وہ لطف نہیں وہ استقلال نہیں - بلکہ اسمیں زیادہ تر انانیت یعنی اہنکار
کے آجانے کا اندیشہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکثر بڑے بڑے مہاتما اور
بڑے بڑے رہروانِ معرفت انانیت یعنی اہنکار سے بری پائے نہیں جا

اور اُنکے کاموں کو فعل سے برت نہیں ہوتی یعنی وہ لوگ فعل کو اپنی ذات سے منسوب کرتے ہیں، کیونکہ پریم نے برہم اوپاسنا یعنی خدا کی عبادت کو نہیں اُکسایا ہے، بلکہ گیان نے پریم کو اُکسایا ہے۔

آئیے ہم اور آپ اس تحقیقات کے بارے میں ذرا ایک دو قدم اور آگے بڑھیں۔ اسیطرح ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اگر بیوی اپنے شوہر کے لئے پریم بس کھانا بناتی ہے اور کھلاتی ہے تو جو لطف اُس کھانے میں قدرتاً آتا ہے وہ اسمیں نہیں آسکتا اگر اُسکو وہ فرض سمجھکر بنائے اور کھلائے۔ اگر وہ پریم بس بناتی ہے تو اس حالت میں اسکو بہتر سے بہتر کھانے بنانے میں پریم محسوس ہوتا ہے اور نہایت ہی شوق و سرگرمی سے اُن سبکو ختم ہی کرکے چین لیتی ہے اور اپنے شوہر کی منتظر رہتی ہے۔ اور یہ بھی چاہتی ہے کہ اُس کھانے کو اُسکا شوہر خوب ہی پسند کرے اور خوب ہی کھائے یہانتک کہ اُسکا شوہر یا اُسکا بچہ سب ہی تو کھالے۔ اُسکے لئے نکچے یا نہ بھی بچے۔ اور اگر وہ کھانے کو اپنا فرض ہی سمجھکر بناتی ہے تو اکثر وہ ٹال بھی جاتی ہے۔ کبھی اُسکو کچھ بہانہ کرنے کی بھی سوجھ جاتی ہے۔ اور تمام طور پر وہ بالکل لاپرواہی سے کھانا بناتی ہے۔ اور کھانا پریم یعنی جان سے خالی ہوتا ہے۔

آپ نے بارہا تجربہ کیا ہوگا کہ ہمارے دل میں کسی اجنبی بچے کے لئے پریم کی موج اکثر یکبارگی اُٹھ جاتی ہے۔ اور اُس بچہ کو ادب سے چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے گویا اُس بچے کو اپنے پریم سے نہلا دیتی ہے تو وہ

بچہ ہماری گود میں فوراً آجاتا ہے اور نہیں بُلا سکا تو وہ دیتا ہی رہتا ہے
اور اگر اُس بچہ کا نزدیکی رشتہ دار محض مصنوعی محبت سے اپنی فرض ادائیگی
کے خیال سے اُسکی طرف اپنا ہاتھ پھیلاتا ہے تو وہ بچہ اُسکی گود میں نہیں آتا
بلکہ منھ پھیر لیتا ہے - اور یہ بھی ہمنے بارہا دیکھا ہے کہ بچے اپنے باپ کے
اُس دوست کے آتے ہی جسکو اُن بچوں سے بے لوث اور دل سے
پریم ہے چاہے وہ دوست اپنے افلاس اور تنگدستی کی وجہ سے اپنے
پریم کے عملی اظہار سے قاصر ہی کیوں نہ رہا کرتا ہو مگر وہ اسکا دروازہ ہی پر خیر مقدم
کرتے ہیں اور پریم اور خوشی کے ساتھ اُس سے چمٹے ہی جاتے ہیں -
اور وہی بچے اگر اُن کا نزدیکی سے نزدیکی رشتہ دار بھی اپنے فرض کے
خیال سے پریم کرنا چاہتا ہے تو وہ اُسکے بلانے سے بھی اُسکے پاس یا تو
نہیں آتے یا آتے ہچکچاتے ہیں اور اگر وہ اُنکو پیسہ یا مٹھائی بھی اظہار
محبت کی غرض سے بطور فرض کے دیتا ہے تو کچھ خوشی سے نہیں لیتے
بلکہ یا تو اُسکے یا اپنے والدین کے خوف سے لیتے ہیں - جو بھید کی بات
اس امر میں چھپی ہے وہ یہ ہے کہ جو لہر ہمارے دل سے نکلتی ہے وہ ایک
طاقت ہے اور ایک بجلی ہے - اور وہ لہر اور وہ بجلی اور وہ طاقت
بالکل اُسی رنگ اور اسی طرح کی ہوتی ہے جیسا ہمارا دل یعنی ہمارے
جذبات اسوقت ہوتے ہیں - خواہ وہ نفرت کے ہوں، مصنوعی ہوں
یا خالص پریم کے ہوں - اور یقین مانیے کہ خاصکر بچوں کے دل جنکی کہ چاندی
تک اور جملہ انسان بھی عام طور پر اس لہر کے رنگ کو اور اُسکے جذبہ کو

اور لڑکوں میں باہمی کشمکش کا رہنا اور اسٹرائکوں کا ہونا ایک قدرتی بات ہے۔
کاش کہ انکی اعلیٰ تعلیم کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ اپنے شاگردوں کو اپنا بچہ سمجھتے اور
اُن سے بھی وہی پریم کا برتاؤ کرتے اور اُن سے بھی وہی توقع کرتے جو وہ
اپنے بچوں سے کرتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ گزشتہ کانگریس گورنمنٹ
نے بھی اسکولوں اور کالجوں میں اسٹرائکوں کی وجہ کو اس نقطۂ نظر سے نہیں
دیکھا اور نہ انکو اسکے لئے پورا اور کافی موقع ہی تھا۔

ایک قدم اور آگے جو ہم بڑھتے ہیں اور ہندوستان کی موجودہ مختلف
سدھار کرنے والی انجمنوں حتی کہ اس کانگریس تک پر جو ہم نظر ڈالتے
ہیں جو ہمارے مادر وطن کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منظم اور ملکی
نمائندہ انجمن ہے اور جس میں ہندوستان کے چھوٹے بڑے لوگ شریک ہیں۔
اور جو انجمن ۳۵ کروڑ ہندوستانیوں کی اکیلی اور سچی رائے رہی ہے۔ اور جسکے
رہنمایان کی سچی اور لاتمثیل ایثار اور قربانیوں، انکی صداقت اور فراست
کی بنا پر نہ صرف برطانیہ ہی بلکہ تمام دنیا اسکا لوہا مانتی ہے اور جس کا
نصب العین ہی ملک کے اُدھار اور ملک کی مکمل آزادی کا ہے۔ اور
کسان اور مزدور کو پیٹ بھر روٹی بہم پہنچانے کا ہے تو ہم دیکھتے ہیں
کہ اسکو بھی پوری کامیابی ابھی تک نہیں ہوئی۔ بلکہ اسمیں کچھ تھوڑے سے
بڑوں میں رقابت اور نفسانیت اور مخالفت پائی جاتی ہے۔ گویا جملہ
رہنماؤں میں بھی آپسمیں اور کچھ بڑوں اور چھوٹوں میں بھی سچا پریم نہیں
ہے۔ بہ الفاظ دیگر زیادہ تر اور عام طور پر پریم نے ان سب کو ایک جگہ

اکٹھا نہیں کیا ہے۔ بلکہ اُس سمبندھ یعنی اُس رشتہ نے جو ایک خیال
کے لوگوں میں پیدا ہوا کرتا ہے انکو جوڑا ہے۔ یہ وہی سمبندھ ہے
جو ایک ریل یا ایک جہاز کے مسافروں میں ہو جایا کرتا ہے۔ جو پریم تو
ایک معنی میں ضرور ہے مگر وہ صرف وقتی ہے۔ جسکو نہ پائیداری ہے
نہ استقلال، اسلئے اگر آپ بغور دیکھیں تو صاف صاف نظر آئیگا کہ اکثر
لوگوں کے ایثار پریم بس نہیں تھے۔ بلکہ فرض کے خیال سے تھے۔ بالفاظ
دیگر ہمارے تھوڑے سے رہنمایان کو اُس فرض کے خیال نے تن من اور
دھن کے ایثار کرنے کے لئے اور جملہ جان و مال کی قربانیوں کے لئے
اُکسایا تھا اور مجبور کر دیا ہو۔ انکا بطور ایک ہندوستانی کے اپنے ملک اور
اُسکے کسان اور مزدوروں سے ہمدردی کا اُنکو حقیقی اور دلی احساس ہے
کا ثمر سب ہی کا یہ ایثار ملک کے پریم اور کسان اور مزدور کے پریم یعنی
اُنکی تکالیف کے حقیقی رحم نے اُکسایا ہوتا۔ حالانکہ یہ پرکار نیکی اور
ایثار دونوں ہی صورتوں میں ہے۔ مگر نقطہ نظر طرز عمل اور نتیجے میں بالکل ایسا
زمین اور آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔

اسلئے جس طرح عقل اور علم دونوں ہی کے لئے پریم کی روح یعنی جان
ایسی ہی ضروری ہے جیسے جسم کے لئے جان ہے اسیطرح اپنی خیرات، پُن کا
خدمت ملک و دنیا اور جملہ قربانیوں میں اور اپنی عبادت میں بھی اور اپنے
جملہ افعال میں پریم کی جان ہونا ضروری اور لازمی ہے۔ بالفاظ دیگر ہمارے
جملہ خیال، گفتگو اور افعال فرض کے خیال سے نہ ہوں بلکہ پریم بس ہوں۔

یعنی انکو ابھارنے والا صرف وہ فرض ہے جنکا انکا مورث سے واسطہ ہے یعنی انکو ابھارنے والا وہ پریم ہو جو ہمکو کسی کام کیلیے، وہاں لوگوں کے لیے ہے جنکا اس کام سے تعلق ہے۔

اور ہر جذبہ کی تحریک ہمارے دل ہی سے ہوتی ہے اور ہر جذبہ کی تحریک کرنے والے ہم خود ہیں۔ اسلیے ہماری نظر ہمیشہ اپنے دل ہی کی طرف ہو کہ کہاں سے کونسی لہر اُٹھے اور جو کبھی خیال پیدا ہوا اور جو کبھی موج آئے وہ پیار، ہمیشہ پریم کی ہی ہو۔ اور چونکہ دنیا کو ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں یعنی جیسے ہم خود ہیں ویسی دنیا ہمکو دکھائی دیتی ہے۔ یعنی اگر ہمارے دل پاک ہیں تو دنیا بھی ہماری نظروں میں پاک ہے۔ اسیطرح اگر ہمارے دل میں پریم ہے تو ہمکو آگے پیچھے دائیں اور بائیں اوپر اور نیچے پریم ہی پریم نظر آئیگا۔ اور یہی بہشت ہے

جہاں پریم ہے وہیں بہشت ہے

اپنے پیارے ناظرین کے روزانہ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے غور اور دھیان کا مظہر تنہائی میں فکر اور شغل اور اپنی زندگی ایک بہشتی زندگی ہو جانے کی بات یہ بھی ہے کہ اوّل تو ہر شخص کو اسکا بخوبی احساس ہے کہ سب جانداروں میں ایک ہی سی جان ہے۔ بلکہ ہماری گزشتہ تحقیقات کو سائنس کے موجودہ محققین نے بھی اب تسلیم کر لیا ہے کہ نباتات میں بھی جان ہے۔ یہ بھی سب جانداروں کی طرح خوشی رنج اور دکھ سکھ محسوس کرتے ہیں۔

دوسرے ہر شخص کو اس بات کا بھی علم ہے کہ تمام انسانوں میں ایک ہی
سی روح یعنی دودانی، ناظر اور تارک آتما ہے جو ایک گاڑی بان کی طرح
ہمارے جملہ حواس خمسہ اور اعضا یعنی گیان اور کرم اندریوں وغیرہ سے
اپنے اوزار پران کے ذریعہ کام لیتی ہے۔ انکو چلاتی ہے اور قاعدہ میں
بھی رکھتی ہے۔

تیسرے ہر شخص اس بات کو بھی جانتا ہے کہ ایک گاڑی بنانے والے
کی طرح ہمارے حواس خمسہ، ہمارے سب عضووں اور جسم کو بنانے والا
جن سے کہ نہایت ہی عجیب اور حیرت انگیز بناوٹ، جوڑ اور ترتیب
اور ان کے الگ الگ باقاعدہ اور محدود اور مقرر کاموں نے بڑے سے
بڑے حساب دان اور سائنس دان لوگوں کو دریائے حیرت اور عبرت
میں غرقاب کر دیا ہے۔ اور دنیا کی جملہ ذی روح اور غیر ذی روح اور متحرک
اور غیر متحرک سب ہی اشیاء کا بھی پیدا کرنے والا قائم رکھنے والا اور فنا کرنے
والا قادر مطلق پاک پروردگار ایک ہی ہستی ہے

چوتھے اس بات کو بھی ہر شخص جانتا ہے کہ سب انسانوں میں، حیوانوں
میں، چرندوں اور پرندوں میں، درختوں، پتیوں اور پھولوں میں، سورج
چاند اور تاروں میں، پہاڑوں، دریاؤں اور سمندروں میں یعنی ساری
کی ساری خلقت میں جو جان رکھتی ہے اور جو جان نہیں رکھتی ہے سب میں
خلا میں ہمارے پران اور ہماری روح یعنی آتما میں بھی خلا کی طرح بلا فاصلہ اندر
باہر منقسم ہوئے اندر اور باہر پایا جاتا ہر وقت موجود ہے۔ بہ الفاظ دیگر

حاضر و ناظر، بسیط کُل، محیط کُل پرماتما کے اندر سب کے سب موجودات ہر وقت داخل ہو رہے ہیں۔ یعنی اُس سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ اور پرماتما اُن سب موجودات کے اندر موجود ہونے کے باعث خود بھی اُمیں داخل ہے۔ یعنی سب میں خدا اور خدا سب میں ہر وقت موجود تھا، موجود ہے، اور موجود رہے گا۔

پانچویں اسبات کو بھی ہر شخص سمجھتا ہے اور سمجھ سکتا ہے کہ علیم کُل، منظم کُل، لاتمثیل اور لامحدود، داور سب قادروں سے قادر کے عکس منعکس ہونے کے باعث یعنی پرماتما کی موجودگی سے از خود پیدا شدہ شکتی کی وجہ سے ہماری بدھی، ہمارا من، ہمارے حواس خمسہ اور ہمارے سب عضا، یعنی گیان اور کرم اندریان از خود اپنا اپنا کام کرتی ہیں جو اُن کے لئے رب العالمین نے مقرر کر دیا ہے۔ کیونکہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آنکھ کے دیکھنے کا کام زبان یا کان سے لیا جا سکے۔ یعنی ایک اندری کا کام دوسری سے لیا جا سکے۔ اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اپنے مُنہ میں مختلف اقسام کے حروف کے اظہار کے لئے مقرر کی ہوئی جگہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ سے بھی ہم حروف کا تلفظ ہماری زبان ادا کر سکے۔ بالفاظ دیگر ہماری اندریاں بھی خلاق دو عالم کی مدد کی محتاج ہیں۔ اور اسکے اٹل قانون کی بھی پابند ہیں۔ اسیطرح پرسور رشا، چاند، تارے، زمین و آسمان، ہوا، آگ، پانی، مٹی اور خلا وغیرہ جو خداوند تعالیٰ کی طاقت کی مدد سے حرکت میں آتے ہیں۔ نہ تو اجرام فلکی آپسمیں ٹکراتے ہیں، نہ زمین ہی سورج کے چاروں طرف گھومتی ہوئی کہیں ٹکراتی ہے۔ بلکہ یہ سب اپنا اپنا مقررہ

کام جو کسی در یوں اور شوق کے ساتھ بلا خوف و خطر اور بلا چون و چرا کئے چلے جاتے ہیں اور پابند اوقات بھی ہیں۔

چنانچہ دنیا میں جو بھی حرکت ظہور پذیر ہوتی ہے خواہ وہ حرکت انتظامی ہو جسمیں پیدا ہونا، بڑھنا، ایک حد تک بڑھ کر رک جانا شکلیں تبدیل کرنا گھٹنا اور ناش ہو جانا پایا جاتا ہے اور خواہ وہ حرکت ارادی ہو جسمیں علاوہ حرکت انتظامی کے اوصاف کے اپنے ارادے سے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے اور الٹا کرنے کی طاقت بھی پائی جاتی ہے۔ غرضکہ دونوں کی دونوں حرکتیں جو دنیا میں ہوتی ہیں پیدا کنندہ کی مدد سے ٹھیک اسیطرح ظہور میں آتی ہیں جس طرح ایک چمبک پتھر کے نزدیک آنے سے لوہا چلتا ہے یا جیسے بجلی گھر کی بجلی کی اکیلی قوت تمام شہر اور میلوں تک کے قصبوں کے قسم قسم کے لیمپوں، جھاڑوں اور فانوسوں کو روشن کر دیتی ہے۔ اور ہزاروں اقسام کی کلوں، مشینوں اور پنکھوں وغیرہ کو چلاتی ہے۔

اور ٹھیک جیسے نہ چمبک پتھر اور نہ بجلی کی طاقت کو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ اسیطرح صورت اور شکل سے مبرا آنکھوں سے بھی نظر نہ آنیوالا خدا کو بھی ہم حواس خمسہ سے جان نہیں سکتے۔

اور ٹھیک جیسے نہ چمبک پتھر اور نہ بجلی کی طاقت اُن سب چیزوں سے آلودہ ہوتی ہے جیسے کہ سورج کی کرنیں، حالانکہ دنیا کی پاک سے پاک اور گندی سے گندی چیزوں پر پڑتی ہیں مگر اُن سے ملوث نہیں ہوتیں اسیطرح سب کے اندر رہنے والا سب کے دلوں کا حال جاننے والا

سمٹ جانے کے ہیں۔ چنانچہ ایک تو ہم تنہائی میں اُن سب حقیقتوں پر پوری
یکسوئی کے ساتھ تصور کیا کریں اور دوسرے جب ہم دنیا کی کسی چیز پر
اپنی نظر ڈالیں تو انھیں پانچوں صداقتوں کو اسوقت اپنے دھیان میں
لے آیا کریں اور انکو پیش پیش رکھا کریں جسکی عادت تھوڑی سی مشق
سے بآسانی ہو جاتی ہے اور ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ اپنا ارادہ ہو۔
اور ارادہ مصمم ہو، اور واقعہ یہ ہے کہ ان سب باتوں پر بھی عبور پانا
اور اسکا حصول بھی صرف تل کی اوٹ پہاڑ ہے۔ مطلب یہ ہے۔ در
جو بات بالکل مشکل نہیں ہے کہ ہم ذرا غور اور خاموشی کے ساتھ اس
بات کو بس دیکھا کریں اور دل ہی دل میں محسوس کیا کریں کہ ہمارے آس پاس
کے جملہ چرندے اور جانور اور خصوصاً اُن کے چھوٹے پیارے ننھے بچے
کیا کیا کلیلیں مار رہے ہیں۔ کیا کیا دل لبھانے والی حرکتیں کر رہے
ہیں۔ اور کیا کیا بول رہے ہیں اور کیسے پریم کے ساتھ ہماری طرف
دیکھ رہے ہیں۔ اور قسم قسم کی خوشنما، خوش رنگ اور خوش الحان
چڑیاں کس انداز سے پھدک رہی ہیں۔ کیا کیا کر رہی ہیں۔ کیسی میٹھی
آوازیں لگا رہی ہیں۔ اور کیسے سہاونے اور سُریلے گیت بھی گا رہی
ہیں۔ اور ہر انسان چھوٹا اور بڑا اور ننھے سے ننھا دودھ پیتا منا
بھی کیا سوچ رہا ہے اور کس دھیان میں مگن ہے۔ مرد اور عورتیں،
اور لڑکے اور لڑکیاں کیا کیا کہہ رہے ہیں۔ اور خلقت کی خلقت انھیں
کاموں میں کیسی ہمہ تن لگی ہے اور انھیں کاموں میں اسکو کیسی لگن ہے

جنکو خداوند عالم نے اسکے سپرد کیا ہے اور جس کام کے کرنے کے لئے
وہ پیدا ہوئی ہے بجنسہ جیسے کسی تھیٹر یا فلم میں جس نے جو بھی سوانگ
بھر لیا ہے اسکو وہ کس خوش اسلوبی - جوش، حوصلہ اور لطف کے ساتھ
ادا کرتا ہے - اور پھر اپنے جملہ فرائض منصبی کو خوبی - دلچسپی اور پریم کے
ساتھ پورا کرتا ہے - اسلئے وہ نہایت خوش خوش ہماری آنکھوں سے
چشم زدن میں مقررہ وقت پر اوجھل ہو جاتا ہے - اور پلک مارتے ہی
دوسرا دلکش سین ہمارے سامنے آجاتا ہے -

چنانچہ اس تھوڑی ہی مشق اور شغل سے ہمکو اسبات کا حق الیقین
اور عین الیقین قطعی طور پر ہو جائیگا - اور روز روشن کی طرح یہ بات
بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہر وقت اب رہا بھی کریگی کہ حالانکہ اس
دنیا میں ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں ان گنتی مختلف مختلف قالب اور
بھیس اور جسم اور شکلیں ہیں - اور ان کے خواص اور فرائض متعلقہ بھی
ان گنتی جدا جدا ہیں مگر حقیقتاً جو شئے ان سب کو اپنے اپنے کاموں کے
کرنے کے لئے متحرک کرتی ہے وہ ان سب میں ایک ہی ہے جسکو ہم جس
نام سے چاہیں پکاریں اور یاد کریں اور جو قادر مطلق ہے - علیم کل ہے
فہیم کل ہے - عقل کل ہے - اور راحت یعنی آنند وغیرہ کا لامحدود
مخزن ہے - اگر اس نگاہ اور اس نظریہ اور اس بھاؤ سے ہم اور آپ
کل قدرت کو اور کل خلقت کو انسانوں کو حیوانوں کو چڑیوں کو درختوں کو
دریاؤں اور پہاڑوں کو یعنی کہ پوری خلقت کو دیکھا کریں تو پھر دیکھئے

کہ آپ کو کیا لطف آتا ہے - اور پھر آپکو خود کیسی خوشی اور کیسا آنند محسوس
ہوتا ہے اور پھر آپکو اُن سے کیسا پریم بھی نہ خود ہو جاتا ہے - جو اُس لامحدود
پریم کے بے پایاں بحر کی ایک بوند ہے جو پروردگار عالم رحیم اور کریم خدا کو
اپنی پیدا کی ہوئی پوری خلقت سے ہے ۔

غرضیکہ جس وقت آپ اس محبت بھری نگاہ کو دنیا پر ڈالیں گے اور
پھر پریم ہی کا بول بولیں گے اور پریم ہی بس سراپا کام کو کریں گے تو
آپکو خود اپنے چاروں طرف اور آپ کے چاروں طرف کے سب لوگوں
کو آنند ہی آنند محسوس ہوگا - اور جب آپ کے خیالات گفتگو اور افعال
میں بے لوث پریم ہوگا تو آپ کو حقیقی شانتی اور آنند اور شکھ محسوس
ہوگا اور ملیگا - اور دنیا بھی آپکو شکھی دیکھکر شکھی ہوگی کیونکہ شکھی وہی
ہے جسکو دیکھکر شکھ حاصل ہو اور شانت بھی وہی ہے جسکو دیکھکر شانتی
حاصل ہو - اور خوش بھی وہی ہے جسکو دیکھکر خوشی حاصل ہو - اور ساتھ ہی
ساتھ یہ بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ وہ حقیقت میں پریم ہی
ہے - جسکے ایک بیج سے نکلے ہوئے بیشمار درخت ہیں - جنمیں صبر قناعت
اور ہمدردی اور رحم وغیرہ کے بیشمار پھل آتے ہیں اور جن پر دنیا جیتی ہے
اور پریم کا وہ اکیلا سوتا ہے جسکے بردباری - شجاعت، ہمت، فیاضی،
عفو - تسلیم - انکساری اور حلم وغیرہ صدہا چشمے ہیں - جو ملک اور دنیا کو فیضیاب
کر رہے ہیں - اور جن سے دنیا اپنی پیاس بجھاتی ہے - اور پریم ہی کا وہ اکیلا
درخشاں آفتاب ہے - جسکی پاک باطنی، سچائی - نیکی راستی - اور راستبازی

شانتی اور آنند لاتے اور کرتے ہیں جو دنیا کو گیان کی بخشش سے منور
کر رہی ہیں۔ اور جنکی وجہ سے دنیا زندہ اور قائم ہے۔ اسلئے ہمیشہ رہی
اور سب ہی سے بے لوث پریم کرنا ہی اپنے اور اپنے ملک والوں اور
دنیا بھر کے لئے سب آنندوں کا آنند ہے۔ سب سکھوں کا سکھ
ہے۔ اور اس پریم کا تعلیم بھی اپنے ایک بول میں ہے۔ چنانچہ جہاں
بھی سکھ ہے اور آنند اور شانتی ہے وہی بہشت ہے۔ اور اسی
میں بہشت کے سب سکھ ہیں اور بہشت میں رہنا یعنی بہشت جیسی
زندگی کا گذارنا ہر انسان کا قدرتی حق ہے۔ اور قدرت کا منشا
بھی یہی ہے۔ اور یہی مشن بھی اس بہشت نما کتاب کا ہے۔

آداب عرض

قبل اسکے کہ میں اپنے محترم بزرگوں اور اپنے اور اپنے ملک
اور دنیا کی آئندہ کے لہلہاتے ہوئے خوشگوار غنچوں، نوجوانوں اور بچوں
سے اب اجازت چاہوں، چلتے چلتے یہ بھی عرض کر دوں کہ چونکہ دل کو
دل سے چاہ ہوتی ہے اسلئے آپ کا دل بھی اس بات کو یقینی محسوس کرتا
ہوگا کہ میں نے اپنے دل ہی کو آپ کے سامنے اس کتاب کی صورت
میں رکھا ہے۔ سونا اور چاندی تو ہاتھ سے دیا جاتا ہے مگر جو کچھ دل سے
دیا جاتا ہے اسکو سونا اور چاندی خرید نہیں سکتے۔ اور کچھ نہیں تو اتنی تو
یہ ہے کہ اسمیں جان بھی ہے اور روح بھی، کیونکہ آپ نے محسوس

کیا ہوگا کہ جو کچھ بھی میں جانتا ہوں یا جو کچھ بھی میں لایا ہوں اُس سب نے میرے پریم کو تمہارے سامنے لایا ہے بلکہ میرے بے لوث اور سچے پریم نے اُن سب کے اظہار کے لئے مجھے اکسایا ہے۔ گزارش میری یہ ہے اور جسکا احساس آپ کے دل کو بخوبی ہو گیا ہوگا کہ اس "بہشت" کے ہر ایک سطر میں پریم کی جان ایسے ہی پروئی ہوئی ہے جیسے دھاگا مالا کے دانوں کو پروتا ہے۔ اور جیسے جسم بھر میں جان پروئی رہتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ کتاب دنیا اور خصوصاً ہندوستان اور اسکے رہنے والوں کے گزشتہ اور موجودہ حالات سے اور معرفت، سیاست، مساوات اور اخلاقی ضروریات کے اٹل۔ اصولی اور قدرتی اور نہایت آسان مشوروں کی علمی اور عملی روح سے قدم قدم پر روشن ہے۔ اسلئے یہ جیتا جاگتا اور بولتا ہوا گلدستہ جسکی مہک اور شیریں آواز کو اپنے عزیزوں، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور ہمسایوں تک اور تمام ملک و دنیا میں پہونچا دینا آپ کا پریم ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کہ میں خود بھی تو ایک ناچیز اوزار ہی ہوں اور ایک ناچیز ذریعہ ہوں مجھ ایسے ناچیز اور حقیر انسان کی کیا حقیقت تھی جو نہ صرف اپنے ہی ملک کو بلکہ یورپ اور تمام دنیا کو عالمگیر سچائیوں کی مشعل ہدایت دکھلانے کی جرأت کرتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کتاب کا لکھا جانا اور اسکا شائع ہونا اسی **حقیقت** کی قدرت کا تقاضا ہے کیونکہ دنیا کا وقت ہی حقیقت میں بدلنے کو ہے اور یہ تو

اُسی حقیقت کی قدرت کی موج ہوا کرتی ہے جو ایک پند یا ایک چند یا ایک چھوٹے سے واقعہ کے ذریعہ سے بھی انسان کی آنکھوں کے سامنے اچانک پلک مارتے ہی غیر معمولی روشنی کا سیلاب یعنی حقیقت کا پورا گیان آگیا ہے اور آجاتا ہے۔

آداب عرض

آپ سب کا خادم و خیر اندیش

بینی پرشاد سنگھ

۱۶ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء

کتاب کے متعلق چند باتیں

قدرتی بات ہے کہ شیر کے دل کو جب چوٹ لگ جاتی ہے تب وہ انتہائی زور کے ساتھ گرجتا ہے۔ اور کالے ناگ کے سر پر ہی جب ضرب لگتی ہے تب وہ اپنے پھن کو اونچے سے اونچا تان لیتا ہے۔ اسی طرح جب انسان کا دل گہرے سے گہرا اور انتہائی زخمی ہو جاتا ہے تب اُسکی روح کے جلال اور عظمت کا بے پناہ اظہار ہوتا ہے۔ اور اس حالت میں انسان اپنے ذاتی طبقہ سے کہیں بالاتر کچھ بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ میری کتاب بہشت کا ہیرو قلم سے لکھا جانا اقدس قدرتی قوانین سے مستثنیٰ

نہ تھا - چونکہ میں نے فروری اور مارچ سنہ ۱۹۴۰ء کے درمیان فیض آباد میں
لکھا تھا - جہاں پر میں بہ سلسلہ ادارت "کایستھ سہکاری" اپنے
عزیز بھائی رائے صاحب شمبھو دیال جی کے یہاں مقیم تھا - سچ ہے کہ
مجھے خود کو دوبارہ مطالعہ پر ہمیشہ ہی یہ حیرت رہی کہ اس کتاب کی تحریر
کام میں کیونکر کامیاب ہو سکا - پیشتر بھی اکثر اوقات خصوصاً اپنی چند انگریزی
تحریرات کے بارہ میں مجھکو اسی قسم کا تجربہ ہو چکا تھا اور جو تجربہ دیگر
اصحاب کو بھی ذاتی طور پر اکثر ہوا کرتا ہے -

علاوہ ازیں تاریکی سے باہر آتے ہی اگر نگاہ آفتاب پر پوری پڑ جاتی
ہے تو آنکھیں چندھیا جاتی ہیں - اور تھوڑی دیر تک کچھ دکھائی نہیں دیتا
چنانچہ جب میں اس کتاب کو لکھ رہا تھا اور اس کے بعد بھی اسکی اشد اور
عالمگیر ضرورت اور اسکے مفید اور مقبول عام ہونے کا مجھکو حق الیقین تو
ہی رہا مگر ہندو کی موجودہ فرقہ وارانہ اور طبقہ وارانہ ذہنیت سے کچھ
کھٹکا سا ہوا - اور ایسا ہوتا بھی ہے کہ اکثر ہم اپنی ہی آنکھوں اور کانوں پر شک
کرنے لگتے ہیں - مگر یہ میرا کھٹکا اوّل اوّل منشی سید اختر حسین نے کافی حد
تک سطحی دور کیا - آنکو میں نے اپنے مسودہ کو صاف لکھنے کے لئے اپنے
دوست بابو [illegible] سرواستو وکیل کی سفارش پر تجویز کیا تھا - انھوں نے
۱۸ اپریل سنہ ۱۹۴۰ء کو مسودہ کی نقل ختم کی - چنانچہ منشی اختر حسین جیسے شخص
کتنے خوش ہوئے اور "بہشت" کے پہلے مسودہ کو شروع سے آخر تک
بار اوّل پڑھا اور دیکھا بھی - انھوں نے کہا کہ مضمون اس قدر زیادہ دل آویز ہے

کہ میں زائد سے زائد روزانہ لکھنے کو مجبور ہوا۔ جوں جوں آگے بڑھتا
تھا کتاب سے میری دلچسپی اور انسیت بڑھتی جاتی تھی۔ اور اسکے اختتام تک
پہنچ جانے کے لئے بیقرار رہا کرتا تھا۔ انھوں نے مجھ سے یہ بھی تیقن
کے ساتھ کہا کہ یہ کتاب کسی قوم اور کسی مذہب کے اصولوں سے کہیں
پہ ذرا بھی نہیں ٹکراتی۔

بعدہٗ مجھکو لکھنؤ جانا تھا۔ میرے مہربان دوست جناب رائے
اماناتھ بلی صاحب رئیس ریاست دریاباد وچیرمین ڈسٹرکٹ بورڈ بارہ بنکی
و وائس چینسلر بھٹکھنڈے یونیورسٹی آف میوزک لکھنؤ نے میری استدعا
پر میرے مسودہ کو بغور ملاحظہ فرمانے کی عنایت کی۔ آپ نے فرمایا کہ "واقعہ
یہ ہے کہ ہر طبقہ کے لوگ اس کتاب کا خیر مقدم کریں گے" اور آپ نے
اپنی رائے بھی مجھکو ۱۹ اپریل ۱۹۴۸ء کو لکھکر دی۔ جسمیں آپ نے
ارقام فرمایا ہے کہ مصنف نے اپنے طبعزاد خیالات کا اظہار بے خوفی
اور سچائی کے ساتھ کیا ہے۔ اور اپنے ملک اور دنیا کو آنند شانتی اور
امن چین کے ساحل تک پہونچا دینے میں کامیاب سعی کی ہے۔ اور یہ
بھی ارشاد کیا ہے کہ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک جاندار
کتاب ہے۔ اور مصنف کو کسی اونچے طبقہ سے روشنی ملی ہے۔

ازاں بعد اس کتاب کے شایع ہونے کے سلسلہ میں میرے کرمفرما
بابو کیسری داس سیٹھ جی صاحب بی۔ اے جنرل منیجر نولکشور پریس نے
میرا تعارف جناب قاضی نصیر الدین احمد صاحب ایم۔ اے۔ یو۔ پی۔ آئی۔ ای۔ ایس

ریٹائرڈ اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس سے کرایا۔ پہلی ملاقات پر مجھکو یہ محسوس ہوا کہ اگر آپ فرشتہ صورت ہیں تو فرشتہ سیرت بھی ہیں۔ اور آپ کے نام نامی سے تو ظاہر ہے کہ علم اور انصاف آپکا ورثہ ہے اور حقیقتاً ہے بھی یہی۔ آپ نے بھی تکلیف گوارہ کر کے میرے مسودہ کو غور کے ساتھ پڑھا اور پھر آپ نے بھی اپنی صائب رائے ۱۰ جون ۵۲ء کو دیکر میرے اوپر بہت ہی بڑا احسان کیا۔ جو اس کتاب بہشت کے دیباچہ کی صورت میں ہدیۂ ناظرین ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ "اس کتاب کی عالمگیر سچائیوں کے دقیق مسائل ہر مذہب و ملت پر واجب التعمیل ہیں۔ اس جملے سے جو نام نہاد کھٹا فرقہ وارانہ اور طبقہ وارانہ ذہنیت والے ملکی بھائیوں کی طرف سے پھیلا دی گئی تھی جاتا رہا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ "ایسی مفید اور محبت سے بھری کتاب جسمیں علم اور طریقۂ عمل دونوں ہی موجود ہوں میری نگاہ سے اردو زبان میں نہیں گزری۔ اور یہ بھی کہ مؤلف نے اپنے واردات قلب کو دنیا کے روبرو پیش کر دیا ہے۔ اور نیز یہ کہ اس کتاب کو انمول کہا جائے تو قطعی مبالغہ نہ ہوگا" قاضی صاحب ممدوح کے ان الفاظ نے میری کمال درجہ ہمت افزائی کی۔ آپ کے بار احسان سے تو میں کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

میں اپنے کرمفرما ڈاکٹر جے کرن ناتھ مسرا صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ ڈی بار ایٹ لا سے بھی ملا۔ باوجود اپنی کمال درجہ کی مصروفیات

نے کیا۔ اور پھر اس کو دوسرا صفہ اور جا بجا املا کی غلطیوں کی درستی کے
کام کو میرے دو مہربانوں بابو ماہیشور پرشاد مہروترا اور بابو شری
کرشن کمار نے کر کے مجھے مرہونِ منت کیا۔

جن میرے عنایت فرماؤں نے اس تصنیف کے سلسلہ میں میری دستگیری
کی ہے۔ اُن کے نامی کو اس کتاب کے ساتھ وابستہ کرنا اور ہمیشہ قائم
رکھنا اور اُن کے احسانات کا احترام اور اپنے دلی اور دائمی شکریہ
کا ادا کرنا میرا ذاتی اور لازمی فرض اور حق تھا۔

مندرجہ بالا تحریر سے میرے لائق ناظرین پر یہ بھی واضح ہو گیا ہوگا کہ
میں نے اس کتاب کو فروری سنہ ۱۹۴۰ء میں لکھنا شروع کیا اور مارچ
سنہ ۱۹۴۰ء کے دوسرے ہفتہ میں ختم کر دیا تھا۔ چنانچہ میرے مہربان
ناظرین کی مزید دلچسپی اور خوشی کا باعث ہوگا۔ اگر میں ملک کے دو چار
چیدہ اور بزرگ ہستیوں کے اُن ارشادات کے کچھ اقتباسات کو بھی
پیش کر دوں جو کہ اُنھوں نے میری کتاب لکھنے کے [illegible] اپنی تحریرات
و تقریرات میں فرمایا ہے۔ اور حسنِ اتفاق یہ ہے اور میری خوش قسمتی
بھی ہے کہ اُنھوں نے میری کتاب کے چند اصولی مسائل پر بالکل ویسی ہی
روشنی ڈالی ہے اور ملک اور دنیا کو وہی مشورہ دیا ہے جو میں پہلے ہی
اُسمیں تحریر کر چکا تھا۔

تاریخ ۱۲ اپریل سنہ ۱۹۴۰ء دہلی میں ایک دعوت کے موقعہ پر جو

سر محمد ظفر اللہ صاحب ممبر قانون گورنمنٹ آف انڈیا نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ "مشرقی جنگ کے چاہے کوئی سیاسی اور قدرتی وجوہات ہوں مگر روحانی وجہ یہ ہے کہ دنیا دہریت کی طرف جا رہی ہے یعنی خدا کی منکر ہو رہی ہے۔ اس جنگ کا یہ لازمی نتیجہ ہوگا کہ موجودہ تہذیب اور کلچر ختم ہو۔ اور بجائے اسکے ایک نئی تہذیب اور نئے دور کا آغاز ہو۔ ایسے وقت میں انسان کے لئے لابدی ہے کہ وہ خدا کی مرضی کا جویاں ہو۔ اور اپنی زندگی اور رویہ کو اسکے مطابق بنا لے۔

(۲) بتاریخ ۱۶ اپریل سنہ ۱۹۴۰ء اپنے ایک مضمون میں مہاتما گاندھی نے فرمایا ہے:-

"آزادی کے شیدائی کے دلوں میں غیر ملکی حکمران سے برسر پیکار ہونے اور ہندوستان سے انکو باہر کر دینے کی جوش کی آگ ہے۔ اور وہ لوگ ان پر جملہ اقسام کی تہمتیں لگاتے ہیں۔ مگر اپنے خود کے اندر کا کوئی عیب انکو نظر نہیں آتا۔

(۳) بتاریخ ۱۶ مئی سنہ ۱۹۴۰ء بمقام مظفرپور جناب سری کرشن سنہا صاحب سابق وزیر اعظم بہار نے فرمایا ہے کہ "جنگ اس وقت تک ختم نہ ہوگی جبتک کہ دنیا میں ایسے دور کا آغاز نہ ہوگا جسکی بنیاد سچائی اور عدم تشدد ہو۔ اور جسمیں دنیا کی مختلف قومیں ایکدوسرے کے ساتھ مساوات اور انصاف کا بیوہار نہ کریں۔"

(۴) بتاریخ ۲۶ رمئی ۱۹۴۰ء مہاتما گاندھی نے اپنے ایک بیان میں تحریر کیا ہے۔

"میں جانتا ہوں کہ میری سخت آزمائش کا وقت ہے۔ میرے پاس اس کے انتہائی ثبوت موجود ہیں کہ بہت سے کانگریس والوں کے دلوں میں بہت ہی زیادہ تشدد ہے اور بہت ہی زیادہ خودغرضی"

(۵) بتاریخ ۸ رجون ۱۹۴۰ء مہاتما گاندھی نے اپنے ایک بیان میں ارشاد کیا ہے:-

"میں ایک خیراندیش اور نیک یا کسی قسم کی بھی ڈکٹیٹرشپ (مطلق العنانی) کو پسند نہیں کرتا۔ نہ تو امیر ہی فنا کئے جا سکتے ہیں اور نہ غریبوں کی ہی محافظت ممکن ہے۔ یہ ضرور ہے کہ تھوڑے سے امیر ختم کر دیئے جائیں اور تھوڑے سے غریبوں کو حلوا کھلا دیا جائے۔ کیونکہ امیر اور غریب دونوں ہی بدستور قائم رہیں گے چاہے وہ کتنی ہی نیک اور خیراندیش ڈکٹیٹرشپ کیوں نہ ہو۔ اصلی جمہوریت تو وہی ہے جو عدم تشدد جمہوریت ہو۔ بالفاظ دیگر جس میں سب ہی کو سچی تعلیم حاصل ہو۔ امیر لوگوں کو خدمت اور غربا کو اپنی مدد کا سبق ملے"

(۶) بتاریخ ۱۹ اگست ۱۹۴۰ء جناب پادری ٹمپلن صاحب نے مشن کی سرمایہ داری کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:-

"سرمایہ داری چاہے وہ جاپانیوں کی ہو، اٹلی کی ہو، امریکنوں کی ہو برٹش کی ہو وہ دراصل سرمایہ داری ہی ہے۔ سرمایہ داری دائمی امن

کی پیری ہے۔ اسکی بنیاد جبر پر ہے۔ اگر شانتی کا قیام مدنظر ہے تو سرمایہ داری کو ختم ہونا چاہیئے۔

نوٹ:— پادری صاحب نے سرمایہ داری کی تعریف "جبر" بتلائی ہے اور میں نے اسکی تعریف اس کتاب میں "خود غرضی" مانی ہے۔

(۷) بتاریخ یکم ستمبر سنہ ۴۰ء بموقع جلسہ کلکتہ یونیورسٹی جناب سر راوھا کرشنن نے ارشاد فرمایا ہے:-

"جو لوگ اکثر قیاس آرائی میں لطف اندوز ہوا کرتے ہیں وہ اس خیال کے خوگر ہوتے ہیں کہ دنیا کے فنا ہونے کے لئے یا تو کسی ستارہ کا حملہ ہوگا یا آفتاب کی گرمی مفقود ہوگی یا کوئی زہریلی ہوا چلیگی۔ مگر میری رائے میں دنیا کے فنا ہونے کے لئے کسی ایسی بلا کی ضرورت نہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ دنیا اگر فنا ہوگی تو انسان کی خود غرضی۔ انسان کے جہل اور انسان کی دہریت اور مادہ پرستی کی وجہ سے فنا ہوگی کیونکہ بدی کا مسکن انسان کا دل ہے۔ اور آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ کسی معقول تہذیب کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان اپنی فضیلت کو سمجھے یعنی خود کو جانے اور جبتک یہ بات ممکن نہ ہوگی دنیا کی مصیبتیں نہیں جاسکتیں۔ اور دوسری شرط یہ ہے کہ جملہ خلقت خدا یہ سمجھے کہ ہم سب انسان بھائی بھائی ہیں۔

(۸) بتاریخ ۱۷ ستمبر سنہ ۱۹۴۰ء بموقع جلسہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی

جناب سردار ولبھ بھائی پٹیل نے فرمایا ہے کہ:

"ہندوستان میں کمیونزم نہیں پھیل سکتی ممکن ہے کہ محدودے چند اصحاب اسکے گرویدہ ہوں مگر عوام کے خیالات تو کمیونسٹ اصولوں کو قبول نہیں کرسکتے۔"

(۹) بتاریخ ۲۸ دسمبر ۱۹۴۰ء بموقع گولڈن جوبلی مدراس کرسچین کالج جناب سر رادھا کرشنن صاحب نے فرمایا ہے کہ مجھکو یقین کامل ہے کہ ملک اور دنیا دونوں کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ سچی روحانی بیداری ہے۔ اور اس روحانی بیداری کی بنیادی وسعت کا اسقدر وسیع ہونا ضروری ہے جسقدر کہ بشریت خود وسیع ہے۔ تا وقتیکہ تہذیب کو روحانی رہنمائی میسر نہیں موجودہ تہذیب فنا ہوجانے کے مستوجب ہے۔ اور اسکو فنا بھی ہو جانا چاہیئے

(۱۰) بتاریخ ۱۱ جون سنہ ۱۹۴۱ء مہاتما گاندھی نے اپنے بیان میں کہ کل دنیا کیا ہوگی فرمایا ہے:-

"میری آنکھوں کے سامنے ہے کہ آنیوالی دنیا میں مفلسی مفقود ہوگی۔ جنگ وجدل ہوگے اور کشت وخون کا فور ہوجائینگے اور اس دنیا میں خدا پہ اتنا گہرا اور پختہ اعتقاد ہوگا جتنا کہ گذشتہ میں نہ تھا۔ ایک وسیع ادراک میں دنیا کا وجود ہی مذہب پہ موقوف ہے۔ اسکی بیخ کنی کی کوششیں ناکام ہونگی"

(۱۱) بتاریخ ۲۶ جون سنہ ۱۹۴۰ء مہاتما گاندھی نے فرمایا:-

"تجربے سے میرا یہ یقین اٹل ہو گیا ہے کہ بالکل ریاضی تناسب سے مطابق ہماری کامیابی اسیقدر ہوئی جسقدر سچائی اور عدم تشدد ہم میں سرایت ہوئے۔ گزشتہ ۲۵ سال میں عوام کی حیرت انگیز بیداری کی کلی وجہ ہمارے ذرائع کی پاکیزگی ہے۔ اور جتنے بھی تشدد اور ناراستی رونما ہوئے اتنے ہی وہ ہماری ترقی کے سد راہ ہوئے۔

(۱۲) بتاریخ ۴ جولائی سنہ ۱۹۴۰ء مہاتما گاندھی:-

"میرا عدم تعاون "برائی" کے ساتھ ہے۔ نہ کہ برائی کرنیوالے کے"

کتاب شائع ہونیکے مسائل

میرے محب اور بزرگ ناظرین کو نہ صرف میری انتھک پیہم اور چہارسو کوششوں اور لگاتار تفکر کا بلکہ میری اس واجبی آرزو اور مناسب انتشار کا بھی بخوبی احساس ہوگا جو مجھکو شبانہ روز شروع اپریل سنہ ۱۹۴۰ء سے آج دن تک اپنی اس کتاب کو آپکے ہاتھوں میں پہونچا دینے کا متواتر ہی رہا ہے۔ اور یہ بھی واقعہ ہے اور درست بھی ہے کہ حال کے پکڑے ہوئے پنجرے میں بند شیر کو اپنی رہائی کی کود پھاند اور قدرتی بے چینی کہیں کم ہوتے ہوں گے۔ بمقابلہ اس کمال اور جائز بے چینی کے جو میری روح کو اس کتاب کے شائع ہونے کے لئے خاصکر ان مختلف مواقع پر ہوا کی ہیں۔ جبکہ وقتاً فوقتاً اس عرصہ میں ہندوستان کی عظیم ہستیوں کے مندرجہ بالا

بارہ ارشادات انگریزی اخبارات میں شایع ہوئے۔ اور پھر اس حالت میں جبکہ اپنے
ارشادات میں اُن بلند ہستیوں نے دنیا کی بالکل وہی رہنمائی کی ہے اور بالکل وہی روشنی
دنیا کو دی ہے جسکا نہ صرف مشرح اور مکمل اظہار اس کتاب میں قبل ہی سے ہو چکا تھا۔ بلکہ
اپنے بزرگ محسنوں کے دست مبارک سے اردو ہندی دونوں میں دیباچے اور انکی رائیں
دستیاب ہو جانے کا فخر بھی اُسکو حاصل ہو چکا تھا۔

اور جبکہ میرا یہ بھی یقین تھا کہ اس کتاب کو خداوندعالم ہی نے مجھ حقیر خادم ملک کے
قلم کے ذریعہ لکھوا دیا ہے اگر گذشتہ پانچ سال میں میری بے بسی اور ناکامی کی وجہی پریشانی
کا کسی شخص کو بھی گمان تک نہ ہوتا اور میرے صبر و استقلال اور متواتر کوششوں کو
دھکا بھی نہ لگتا بس اسی کا لا متناہی سہارا تھا۔ اور جب میری اس کڑی اور کمال درجہ
کی آزمائش کی مقررہ میعاد ختم ہوگئی تو اسی کی رحمت اور اسی کے حکم سے وہ دن
اب آیا جبکہ میں خود ہی کو محدود سے چند ہی کتابوں کی اشاعت کے مابر کا اہل ہوا۔
اور آپکے ہاتھوں میں اُسکے پہنچ جانے کی امید بندھی۔ حالانکہ کاغذ غنقا ہے۔

انسان اپنی اور دوسرونکی بھلائی کیلئے نہ معلوم کیا کیا سوچا کرتا ہے مگر ہوتا ہے
وہی جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اور جسمیں پھر اُسکی اور دوسرونکی بھلائی سقدر بھی اور
اتنی بے پایاں ہوتی ہے کہ جسکا اندازہ ممکن نہیں ہے۔ میں نے بھی ان پانچ سال
میں چوٹی سے لیکر ایڑی تک یہ کوشش کی کہ کوئی صاحب پیسہ والے اس
کتاب کو اپنے نام سے ہی منسوب کر کے اپنے صرفہ سے طبع کرادیں اور طبع سکی

ضروری قیمت رکھکر اپنے ہندوستان کے سب ہی بھائیوں، بہنوں اور بچوں کے
ہاتھوں میں اسکو پہونچا دوں۔ مگر خداوند عالم کو بجائے اسکے یہ منظور تھا کہ میں خود ہی گو کم
تعداد میں اس کتاب کو امسال طبع کرانے کا اہل ہوں اور پہلی اڈیشن کی قیمت "انمول"
رکھوں۔ اور اپنے ملک کے تاجداروں یعنی والیان ملک ہز ہائینس پرنسز اور دوسری
چیدہ بزرگ اور متمول ہستیوں کو صرف بطور نذر کے اسکو پیش کروں۔ تاکہ اگر انکی نظر
پاک اس کتاب کی طرف ہوگئی اور انھوں نے بھی اسکو انمول تصور کیا اور انکو یہ یقین
ہوگیا کہ ملک کے جملہ باشندگان کے لئے اس کتاب کی اشاعت نہایت مفید
اور ضروری اور وقتی ہے تو انکے ابر رحمت کا انکی مقدرت کے موافق اسپر برس جانا لابدی
اور قدرتی ہے۔ اور پھر آن کی آن میں اس کتاب کو ہندوستان بھر کے
بھائیوں کے ہاتھوں میں پہونچا دینے کا میں آسانی سے ذریعہ ہوسکوں گا۔ کیونکہ
واقعہ ہے کہ بارش آسمان ہی سے ہوا کرتی ہے۔ اور دریائیں بھی پہاڑوں
کی چوٹیوں ہی سے نکلکر تمام دنیا کو سیراب اور فیضیاب کیا کرتی ہیں۔

علاوہ بریں دوسرے اڈیشن کیطرح یہ بھی عیاں ہے کہ اس کتاب کا اسقدر
بدیر چھپنا خداوند عالم کی لامحدود فہم اور ادراک ربانی کی رو سے دوسری
اسوجہ سے بھی اب مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ موجودہ وقت بمقابلہ گذشتہ
پانچ سال کے اس کتاب کی عام اشاعت اور اسکے عام طور پر خیر مقدم کے
لئے کہیں زیادہ بہتر ہے جبکہ اسوقت دنیا کے بڑے اور چھوٹے امیر اور
غریب اور ہر کس و ناکس اس عالمگیر لڑائی ہولناک کشت و خون سے تلملا اٹھا ہے

گھبرا گیا ہے اور ان نورانیوں کی جستجو میں بے قرار اور پریشان ہے جو تارک
دنیا ہیں۔ اب دیکھو کہ اس سکھ چین اور آشتی کے ساتھ رہ سکتی ہے جو
گیان علمی اور عملی دونوں اس کتاب میں ترجمہ کروا کے ایک چھوٹی سی
لکھوا دیا ہے۔

خادم ملک و قوم
بینی پرشاد سنگھ

۲۰ اپریل ۵۸ء

نوٹ

بمصداق اس مقولہ کے کہ "تصنیف را مصنف نیکو کند بیان" اگر
کسی راجے مہاراجے یا کسی اور صاحب کی موج میں آئے تو اس کتاب کو ان کو
اور ان کے متعلقین کو سنا دینے اور تبادلہ خیالات کے لئے مصنف کی خدمات
حاضر ہیں۔

بہشت

مصنفہ : ——— بابو بینی پرشاد سنگھ

خط و کتابت کا پتہ :- بابو بینی پرشاد سنگھ منیجر
اودھ کمرشیل بنک لمیٹڈ فیض آباد

قیمت .. .. مول

پبلیشر
میسرز مولچند اینڈ برادرس چوک فیض آباد
مطبوعہ
آفتاب پریس فیض آباد
زیر اہتمام رائے صاحب بابو سمبھو دیال بھٹناگر آنریری مجسٹریٹ
مالک آفتاب پریس فیض آباد